فرحت اشتیاق

مکمل ناول

وہ سولہ فروری کی ایک خوب صورت دوپہر تھی اور اس دوپہر وہ آفس سے لنچ ٹائم ہی میں نکل آئی تھی۔ اس کی پہلی منزل پیوٹی پارلر تھی، جہاں اسے اپنے بالوں کی کٹنگ کروانی تھی۔ پارلر میں زیادہ دیر رکنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا، اسی لیے فیشل کے ارادے کو اس نے ملتوی کر کے گھر پر خود ہی کلینزنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بال پچھلے دو ماہ سے توجہ چاہ رہے تھے اور وہ وقت نہ ملنے کے سبب اسے ٹالے چلی جا رہی تھی۔ حمیر بھی دو تین بار اسے ٹوک چکا تھا۔ سولہ فروری کا دن اس کی زندگی کا سب سے اہم ترین دن تھا اور اس دن وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی، اسی لیے بیوٹی پارلر جانے کے ارادے کو وہ اس دن تک ٹالتی رہی تھی۔

پارلر سے فارغ ہونے کے بعد اسے کچھ خریداری کرنا تھی، چند ایک تو گھر کے روزمرہ استعمال کی اشیاء تھیں، خاص طور پر اسے پائن ایپل کاٹن پیک اور فریش کریم خریدنی تھی۔ باقی کیک بنانے کے تمام لوازمات گھر پر موجود تھے۔ سرخ گلابوں کا ایک خوب صورت سا گلدستہ خرید کر اس نے اپنی خریداری مکمل کی اور پھر اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

ان کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس پوش علاقے میں دو کمروں کے اس اپارٹمنٹ کا انہیں اتنا کرایہ دینا پڑ رہا تھا جتنا کسی مڈل کلاس علاقے میں چار پانچ کمروں کے مکان کا بھی نہیں ہوگا۔ لفٹ میں اس کی مسز بونس سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ہائے ہیلو کے فوراً" بعد بے ساختہ اس کے بیوٹی اسٹائل کی تعریف کی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کی تعریف کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ سے نکل آئی۔ اپنی تعریف انسان کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے۔ اسے بھی لگی تھی مگر یہ وہ تعریف نہیں تھی جس کا اسے بے چینی و بے صبری سے انتظار تھا' جس کے لیے آج وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی' اسی کے منہ سے اپنی بے تحاشا تعریفیں بھی سننا چاہتی تھی۔

اپارٹمنٹ کے اندر آتے ہی اس نے مشینی رفتار سے اپنا کام شروع کیا۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کیک بنانے کی تیاری شروع کی۔ کیک کی تیاری کے دوران ہی اس نے اپنے لیے ایک چیز سینڈوچ بنایا اور چلتے پھرتے اسے کھا کر لنچ کر لیا۔ کیک اوون میں رکھنے کے بعد اس نے پہلے ہی سے صاف گھر کو مزید صاف کرنا شروع کیا۔ اس کے گھر کی صفائی' نفاست اور سجاوٹ کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس گھر کی مالکن ایک ورکنگ وومن ہے جو صبح آٹھ بجے گھر سے نکل کر شام چھ بجے گھر واپس آتی ہے۔ اس کام کو نمٹا کر وہ ایک مرتبہ پھر پورے انہماک سے کیک کی جانب متوجہ ہوئی۔

حمیر کی واپسی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اگر کسی میٹنگ میں یا کسی اور جگہ مصروف نہ ہو گیا ہوتا تو وہ آٹھ بجے تک گھر واپس آجاتا تھا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اور اگر آج کا دن اسے یاد نہیں تھا تو پھر تو جلدی واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ پچھلے سال کے تجربہ کو سامنے رکھتے ہوئے قوی امید یہی تھی کہ اسے یاد نہیں ہوگا' اگرچہ کہ صبح اس نے قصداً" حمیر سے "آج کیا تاریخ ہے؟" پوچھا تھا اور اس نے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے فوراً" جواب میں اسے تاریخ بتا دی تھی۔ اسے یاد تھا یا نہیں' وہ وقت پر گھر واپس آرہا تھا یا نہیں' بہرحال اسے تو اپنی تیاری مکمل رکھنا تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر رکھے گلدان میں اس نے اپنے خرید کر لائے ہوئے تازہ سرخ گلاب سجائے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ایئر فریشنر اسپرے کیا۔

حمیر کے لیے تحفہ اس نے کافی دن پہلے ہی خرید لیا تھا۔ وہ کوئی بھی معمولی چیز استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے معیار کے حساب سے یہ انتہائی قیمتی رسٹ واچ خریدنے میں اس کی تمام تر بچت اور اس مہینے کی پوری تنخواہ ٹھکانے لگ گئی تھی مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھی۔ اگر وہ کوئی عام سی گھڑی اسے تحفے میں دیتی تو بخوشی قبول تو وہ اسے بھی کر لیتا' اس کا دل رکھنے کی خاطر دو تین بار پہن بھی لیتا اور پھر اس کے بعد واپس اپنی پرانی قیمتی گھڑی پر آجاتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ گریٹنگ کارڈ لکھنے کے بعد اس نے گھڑی کا کیس اور کارڈ اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر ہی رکھ دیا اور پھر اپنی تیاری شروع کی۔

سیاہ رنگ کی نیٹ کی ساڑھی اس کے نازک سراپے پر بہت سج رہی تھی۔ ساڑھی کے پلو پر سلور نگوں اور موتیوں کا بڑا نفیس کام بنا ہوا تھا۔ اس کام کی مناسبت سے اس نے جیولری بھی سلور پہنی۔ خوب اہتمام سے بھرپور میک اپ کیا' جبکہ روز تو بس بھاگتے دوڑتے لپ اسٹک لگانے ہی کا وقت مل پاتا تھا۔ آئی لائنر' مسکارا اور آئی شیڈو کے بعد اس کی خوبصورت براؤن آنکھیں مزید خوب صورت اور دلکش لگنے لگی تھیں۔ پرفیوم لگانے کے بعد اس نے خود پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور پھر مطمئن ہوتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ آج اسے اس روپ میں دیکھ کر کیا کہے گا؟ کتنے دنوں بعد وہ اتنے اہتمام سے تیار ہوئی ہے۔

"مومی! جلدی گھر آجاؤ۔" اس کی تعریفیں سننے کی اسے بہت بے تابی تھی وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے

تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اس کے موبائل پر کال کر ڈالی۔

"حومی! تم کہاں ہو؟" اس کے کال ریسیو کرتے ہی سلام دعا کے بغیر بے صبری سے بولی۔

"مائی سویٹ وائف! میں اس وقت ارسلان صاحب کے ساتھ اسکواش کھیل رہا ہوں اور آج انہیں ہرائے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔" وہ ہنستے ہوئے جواباً بولا' پھر جیسے ایک دم ہی اس کے بے صبری سے بھرپور جملے پر دھیان گیا تو چونک کر پوچھنے لگا۔

"سب خیریت تو ہے' کوئی پرابلم ہے کیا؟"

"میری سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ اس وقت میرے شوہر صاحب کو میرے پاس موجود ہونا چاہیے اور وہ نہیں ہیں۔ میں تمہارے اسکواش و سکواش کو بالکل نہیں جانتی' بس تم فوراً" گھر واپس آ رہے ہو۔" اکیسویں صدی کی ایک ماڈرن لڑکی ہونے کے باوجود قدرے ایک مکمل مشرقی بیوی تھی۔ شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی' اس کے کیے گئے فیصلوں کو بغیر کسی اعتراض کے قبول کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے والی۔ پر آج کی اپنی اس یادگار شام کو وہ ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی' اسی لیے یوں من مانی کرنے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ماما! میں اس طرح کھیل ادھورا چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ یہ گیم ختم کر لوں پھر میں فوراً" گھر آتا ہوں' اوکے۔" اس کے غیر معمولی ضدی لہجے نے اس سے کھیل جلدی ختم کر لینے اور گھر واپس آنے کا وعدہ لے لیا تھا' ورنہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ارسلان ایاز سے دوستی حمیر کے لیے کتنی اہم ہے۔ وہ ایک بے مثال اور شاندار کیریئر رکھنے والے سینئر بینکر تھے۔ اسکواش کے حوالے سے ہی حمیر کی ان سے دوستی ہوئی تھی اور حمیر اس دوستی کو ہر ممکن حد تک آگے لے جانا چاہتا تھا۔ اکثر ہفتے میں تین یا چار مرتبہ وہ ارسلان ایاز کے ساتھ اسکواش کھیلنے چلا جاتا تھا۔ فون پر بات کر لینے کے بعد جہاں یہ تسلی ہو گئی تھی کہ وہ کھیل ختم کر کے جلدی گھر واپس آ رہا ہے' وہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسٹر بھلکڑ ایک مرتبہ پھر اپنی ویڈنگ اینورسری بھول گئے ہیں۔ بجائے اس سے خفا ہونے کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ دونوں بعض معاملات میں ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں' چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھنے والی اور وہ ان سب کو بھول جانے والا' لیکن جب درمیان میں محبت ہوتی ہے پھر کسی بھی فرق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ دونوں کو یاد نہیں رکھتا تو کیا ہوا' وہ اس سے محبت تو بے پناہ کرتا ہے۔ اس کی نگاہ دیوار پر فریم میں جڑی اپنی شادی کے دن کی تصویر پر گئی۔ وہ اور حمیر دونوں ساتھ' مسکراتے ہوئے۔ سولہ فروری کے دن ٹھیک دو سال پہلے حمیر رضا اس کی زندگی میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی اور کبھی ختم نہ ہونے والی ہنسی بن کر داخل ہوا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم شخص تھا' جس کے

بغیر زندہ رہنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر پل اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے حواسوں پر وہ یوں چھایا تھا کہ اسے اس کے سوا دنیا میں کسی اور رشتے کی کوئی کمی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سر پر باپ کی محبت و شفقت بھری چھاؤں نہیں، بہن، بھائیوں کا پیار بھرا ساتھ نہیں اور ماں..... وہ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں۔ تو کیا ہوا، وہ ایک شخص حمیر رضا تو تھا نا اس کے پاس، ہر دم اس کے ساتھ۔ زندگی سے کبھی کوئی شکوے اگر رہے بھی تھے تو دو سال پہلے حمیر رضا کے ساتھ اس پیار بھری نئی زندگی کی شروعات کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ، حمیر رضا سے پہلی بار ڈاکٹر اعجاز ارشد کے آفس میں ملی تھی۔ پہلی باریوں کہ اس روز پہلی مرتبہ اس کے اس سے گفتگو ہوئی تھی، ورنہ سرسری سا جانتی تو وہ اسے پہلے بھی تھی۔ جب وہ ایم بی اے کرنے کے لیے آئی بی اے میں داخل ہوئی تب حمیر رضا وہاں سے پاس آؤٹ کرنے والا تھا۔ وہ اپنے بیچ ـــــ کے ٹاپ تھری اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھا اور ان دنوں وہ انسٹی ٹیوٹ میں اس حوالے سے کافی مشہور ہو گیا تھا کہ اپنے آخری سمسٹر کے دوران ہی اسے تین بہت بہترین جگہوں سے جاب کی آفرز آچکی تھیں۔ ان آفرز میں سے ایک آفر اس غیر ملکی ادارے سے بھی تھی، جہاں سے اس نے انٹرن شپ کی تھی۔ کچھ لوگ اس سے حسد کرتے تھے اور کچھ رشک۔ بہرحال اس کا ذکر اکثر اسٹوڈنٹس کرتے تھے مگر ڈاکٹر اعجاز ارشد کا وہ خاص طور پر بہت پسندیدہ تھا۔ فورتھ سیمسٹر میں اب جب ڈاکٹر اعجاز ان لوگوں کو پڑھا رہے تھے، وہ اس کی کسی نہ کسی خوبی کا ذکر ضرور ہی کیا کرتے تھے۔ اسے انسٹی ٹیوٹ سے گئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور وہ کہتے تھے کہ وہ ان اسٹوڈنٹس میں سے تھا، جنہیں پچیس تیس سال بعد بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ یوں ڈاکٹر اعجاز ارشد نے ان لوگوں کو ڈیڑھ، پونے دو سال بعد بھی اس بندے کو بھلانے نہیں دیا تھا۔

اس گرم ترین دوپہر میں جب وہ ڈاکٹر اعجاز ارشد کے پرسکون ماحول والے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں داخل ہوئی تو وہ ان کی میز کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کاٹن کا بلیک ٹراؤزر اور بلیو و بلیک اسٹرائپس کی ہاف سلیوز کی قمیض کے ساتھ بلیو کلر کی ٹائی پہن رکھی تھی اور ماہا احمد علی کو یہ تسلیم کر لینے میں قطعاً کوئی تامل نہیں تھا کہ وہ بندہ واقعی بہت ہینڈسم تھا۔ اس کی ڈریسنگ، اس کے بیٹھنے اور بولنے کا انداز سب شاندار تھے۔ وہ ڈاکٹر اعجاز سے اپنی ریسرچ رپورٹ کے متعلق کچھ باتیں پوچھنے آئی تھی مگر وہ فی الحال مصروف نظر آرہے تھے۔

"سر! میں بعد میں آجاؤں گی۔" مگر ڈاکٹر اعجاز نے اسے روک لیا تھا۔ لہٰذا وہ حمیر کے برابر والی کرسی چھوڑ کر اس سے اگلی کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر اعجاز اس کی محنت اور لگن سے بہت خوش تھے، اس لیے وہ جس وقت بھی کچھ پوچھنے ان کے پاس آتی وہ بخوشی اسے وقت دیتے۔ اسے ان سے جو کچھ پوچھنا تھا وہ پوچھ رہی تھی، اس دوران وہ بندہ اس سے اور ڈاکٹر اعجاز سے قطعاً "لاتعلق سامنے شیلف میں لگی کتابوں پر نظریں جمائے بیٹھا رہا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سوالات اور ڈاکٹر اعجاز کے جوابات میں ذرا سی بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کا لاتعلقی سے بھرپور انداز کسی حد تک مغروریت کا حامل تھا۔ مگر پھر نجانے کیوں اس نے سامنے شیلف اور کتابوں سے نگاہیں ہٹا کر ڈاکٹر اعجاز اور اسے دیکھنا شروع کر دیا اور پھر غیر محسوس انداز میں وہ ان کے ڈسکشن میں شریک ہو گیا۔ وہ بڑی روانی و دلچسپی سے ان موضوعات پر بول رہا تھا، بلکہ ڈاکٹر اعجاز کو بھی وہ زیادہ بولنے نہیں دے رہا تھا۔

ابھی وہ چند مزید سوالات ڈاکٹر اعجاز سے کرنا چاہتی تھی کہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے آفس سے ان کا بلاوا آگیا۔

"آئم سوری۔" وہ ان دونوں سے معذرت کرتے

ہوئے اٹھے تو ثمیر سنجیدگی سے ان سے بولا۔

"میرا خیال ہے ان کے ان سوالات کے جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں۔" وہ جواباً کھل کر مسکرائے۔

"بالکل دے سکتے ہو۔ ایک بینکر ان سوالات کے تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو کون دے گا۔ ماہا! آپ ثمیر سے پوچھ لیجئے جو پوچھنا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ اپنے آفس سے نکل گئے تھے اور وہ جو ڈاکٹر اعجاز کو اٹھتا دیکھ کر خود بھی فوراً اٹھنا چاہتی تھی مجبوراً وہیں بیٹھی رہی۔ جو باتیں اس نے ڈاکٹر اعجاز کے اٹھ کر جانے سے پہلے ان سے پوچھی تھیں ان کے وہ بڑے تفصیلی جوابات دے رہا تھا۔ وہ تفصیلات اس کے لیے فائدہ مند تو تھیں، لیکن وہ دل ہی دل میں مسلسل یہ سوچے چلی جا رہی تھی کہ کیا اس بندے کو اپنا کچھ کام دھام نہیں ہے جو اتنی فرصت سے بیٹھا ہوا اسے سمجھا رہا ہے۔

"آپ کہاں رہتی ہیں مس ماہا؟" اس نے اچانک بڑی سنجیدگی و بردباری سے اس سے یہ سوال پوچھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اس کی فائل پر کچھ لکھنے میں اس طرح مصروف تھا جیسے یہ سوال یونہی سرسری سے انداز میں گفتگو برائے گفتگو کے طور پر پوچھ لیا ہو۔

"اپنے گھر میں۔" اس کا دل یہی جواب دینے کو چاہا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے اپنی رہائش کے متعلق بتا دیا۔ وہ اب وہاں سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔

"آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟" کچھ دیر کام کی بات کرنے کے بعد پھر ایک غیر متعلقہ سوال اس سے پوچھا گیا تھا۔ وہ پاگل نہیں تھی جو ان سوالات کا مقصد نہ سمجھ پاتی۔ اسے اندر ہی اندر اس بندے کا خود اعتمادی سے بھرپور ذاتیات کی طرف آنے والا یہ انداز بہت برا لگ رہا تھا مگر وہ براہ راست اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

"ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔" وہ ایک پل کو بالکل خاموش ہوا پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا "آئم ویری سوری۔" اب اس سے پہلے کہ وہ اس کی ممی اور بہن بھائیوں کی طرف آتا وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔

"آپ کا بہت شکریہ آپ نے بہت ساری انفارمیشن مجھے دیں۔" اسے مزید کوئی فقرہ بولنے کا موقع دیے بغیر وہ "اللہ حافظ" کہتی ڈاکٹر اعجاز کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر کسی اور سے تو کیا اس نے کلثوم عدنان جیسی اپنی قریبی دوست تک سے نہیں کیا تھا۔

مگر اگلے روز جیسے ہی وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچی وہ بندہ ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگیا اور تب کوریڈور میں طوبیٰ وغیرہ کے گروپ کے ساتھ کھڑی کلثوم اور صنم نے بھی اسے اس سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔

"السلام علیکم مس ماہا احمد علی۔" وہ اپنی شاندار شخصیت کے سحر کے ساتھ صبح سویرے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے اپنے لہجے میں کل کے برخلاف سختی اور روکھاپن شامل کر لیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ صرف میری خیریت معلوم کرنے صبح صبح کیمپس آئے ہیں؟" اس کے قدرے بدلحاظی کا عنصر لیے ہوئے جواب پر وہ محظوظ ہو جانے والے انداز میں بے ساختہ ہنسا۔

"بینکنگ اسٹوڈنٹس فورم نے آج یہاں ایک سیمینار ارینج کیا ہے میں وہ اٹینڈ کرنے آیا ہوں۔" وہ جلد بازی میں منہ سے نکل جانے والے اس فقرے پر دل ہی دل میں بری طرح شرمندہ ہوئی اور وہ اس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ ذو معنی لہجے میں مسکرا کر بولا۔

"ویسے سیمینار دس بجے شروع ہوگا، میں واقعی جلدی آگیا ہوں۔"

"یہ آپ کا آخری سمسٹر ہے؟" وہ سامنے سے ہٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس نے صرف اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ اس کی ناگواری، اس کی عجلت اور بیزاری کو جیسے سمجھ ہی نہیں

ہوتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ فقط چھ سال کی تھی جب ایک ایکسیڈنٹ میں اس کے پاپا اسے اور ممی کو چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئے تھے۔ اس کے پاپا کی بہت لمبی چوڑی جائیداد تو نہیں تھی' البتہ اتنا پیسہ چھوڑ کر ضرور گئے تھے کہ وہ دونوں ماں بیٹی عزت کی زندگی جی سکیں۔ پھر بھی تنہا تو وہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کی ممی اسے لے کر واپس اپنے میکے آگئی تھیں۔ ممی صرف چھ سات مہینے ہی وہاں اس کے ساتھ رہی تھیں پھر نانا اور نانی نے ان کی دوسری شادی کروادی تھی۔ ممی رخصت ہو کر مظہر آصف جوان کے فرسٹ کزن بھی تھے' ان کے گھر چلی گئیں اور وہ اپنے ننھیال میں رہ گئی۔

مظہر انکل کی پہلی بیوی کا دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت انتقال ہوگیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اس کے لیے اس بات پر سمجھوتا کرنا مشکل تھا کہ اس کا پیارا سا گھر اور اس کے پاپا اس سے چھن گئے ہیں اور ممی بھی اسے چھوڑ گئیں۔ شروع شروع میں وہ بہت روئی' اس نے ماں کے پاس جانے کی بہت ضد کی مگر پھر گزرتا وقت اس میں صبر پیدا کرتا چلا گیا۔ ممی میکے آتیں تو اسے بہت پیار کرتیں' اس کے لیے کھلونے اور چاکلیٹس لاتیں اور اگر مظہر انکل بھی ساتھ ہوتے تو اسے کبھی بھی اس طرح پیار نہ کرتیں جس طرح اکیلے آنے پر کرتی تھیں۔ اس سے زیادہ پیار تو وہ مونا جوان کی سگی بیٹی بھی نہیں تھی اس سے کرتی نظر آتی تھیں۔ پھر ان کی گود میں عبداللہ آگیا۔ مونا سے اگر وہ صرف مظہر انکل کی خاطر دکھاوے کا پیار کرتی تھیں تو عبداللہ تو ان کا سگا بیٹا تھا جس سے وہ والہانہ پیار کرتیں۔

اس کے دل میں ماں کے خلاف بہت سا غبار اور غلط فہمیاں پلتی چلی گئیں۔ یہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں اس وقت مزید شدت اختیار کرلیتیں جب ممانی یا ان کا کوئی بچہ اسے یہ احساس دلاتا کہ یہ اس کا گھر نہیں۔ وہ چودہ سال کی تھی جب آگے پیچھے نانا اور نانی دونوں کا انتقال ہوگیا اور ماموں' ممانی نے ممی سے صاف صاف یہ بات کی کہ پرائی اولاد وہ بھی لڑکی کی ذمہ داری اٹھانے کو وہ تیار نہیں' لہٰذا وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں ممی کے چہرے پر یہ بات سنتے ہی پریشانی پھیل گئی تھی۔ اسے اس وقت اپنا آپ بڑا حقیر اور بے مقصد لگا تھا۔ وہ بہ حالت مجبوری اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لائی تھیں اور اسے دیکھتے ہی مظہر انکل کا منہ بن گیا تھا۔ وہ کئی دنوں تک ممی سے بھی اس بات پر ناراض رہے تھے اور ممی ان کے آگے پیچھے انہیں منانے کے جتن کرتی ماہا کی شرمندگی اور ندامت کو دوچند کردیا کرتیں۔ ماں کے خلاف جو وہ دل میں غلط فہمیاں' نفرتیں اور بدگمانیاں رکھتی تھی اچانک ہی ان سب کی جگہ ترس اور ہمدردی نے لے لی۔ اسے اس عورت پر ترس آنے لگا اور خود پر غصہ۔ وہ اپنی ماں کی پرسکون اور خوشگوار ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے کا باعث بن رہی تھی۔ چاہے یہ حقیقت جتنی بھی تلخ اور ناقابل قبول تھی لیکن اپنی ممی کے اس گھر میں آنے کے صرف ایک گھنٹے کے اندر ہی اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی میں اب اس کی کوئی جگہ نہیں۔

مظہر انکل' مونا اور عبداللہ تینوں میں سے کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا اور ممی صرف اس وقت بات کرتیں جب مظہر انکل آفس گئے ہوتے۔ اس کے تعلیمی اخراجات' اس کے لباس اور دیگر بنیادی ضروریات ابھی بھی اس کے پاپا ہی کے پیسوں سے پوری ہوتی تھیں پھر بھی مظہر انکل کو ایسا لگتا جیسے وہ ان کے بچوں کا حق چھین کر کھا رہی ہے۔ وہ اسکول سے دیر سے آتی تھی تب تک وہ سب کھانا کھا چکے ہوتے تھے۔ مونا کچن میں اس کے کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ بچا ہوا کھانا فریزر میں ڈال دیتی' ماسی کو دے دیتی اور کچھ نہ ہوتا تو اپنی پالتو بلی کے آگے ڈال دیتی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ جو وہ اس ناانصافی پر کسی سے احتجاج کرتی۔ وہ لباس تبدیل کرکے خاموشی سے ٹینک کے پاس والی جگہ پر اسکول کا کام

کرنے بیٹھ جاتی اور وہیں پر پڑھتے پڑھتے سو بھی جاتی۔
یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ماں کی طرف سے یا کسی بھی طرف سے کسی بھی توجہ کے بغیر اس کے امتحانی نتائج ہمیشہ شاندار ہوتے۔ مونا کو تو پڑھائی کا زیادہ شوق تھا ہی نہیں۔ مگر عبداللہ جس پر ممی اور مظہر انکل دونوں بھرپور توجہ دیتے۔ وہ بھی کسی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرپاتا تھا۔ مظہر انکل کو اس کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ مونا کی پڑھائی سے اتنی لاتعلقی اور غیر دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مظہر انکل نے انٹر کرتے ہی اس کی شادی کردی تھی۔ مونا کی شادی سے اسے یہ فائدہ ہوا تھا کہ لاؤنج میں سونے اور گھر کے پچھلے کونے میں یکسوئی سے پڑھنے کے بجائے اب اسے ایک کمرہ مل گیا تھا لیکن وہ اندر سے جانتی تھی کہ نہ یہ کمرہ اس کا ہے اور نہ یہ گھر۔

☆ ☆ ☆

حمیر کے بھائی اور بھابھی اگلے روز شام کو ان کے گھر آئے تھے۔ وہ ممی کو یہ تو بتا چکی تھی کہ وہ اس کا کلاس فیلو نہیں بلکہ اس سے سینئر تھا چھٹی کا دن تھا' مظہر انکل گھر پر ہی موجود تھے مگر انہوں نے ڈرائنگ روم میں آکر مہمانوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا' وہ کون سا ان کی سگی بیٹی تھی جو اس کے لیے آنے والے کسی رشتے میں وہ دلچسپی لیتے۔ حمیر کے بھائی اور بھابھی اس کے تصور کے بالکل برعکس تھے۔ اس کے بھائی صرف شکل میں اس سے ملتے تھے ورنہ ان کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ وہ حمیر کے بھائی ہیں۔ وہ اپنی گفتگو ہی سے واجبی سے پڑھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی بیگم ان سے بھی زیادہ کم تعلیم یافتہ اور عام سی تھیں۔ اس کے بھائی کی مردانہ کپڑے کی دکان تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے تھے' ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ بس دو ہی بھائی تھے۔ وہ حمیر سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ممی کے چہرے پر انہیں دیکھ کر تو کوئی متاثر ہونے والے تاثرات آ نہیں سکتے تھے مگر وہ یہ تو جانتی تھیں کہ جس کے لیے وہ آئے ہیں وہ IBA میں ان کی بیٹی سے سینئر تھا۔ اپنے بھائی کے متعلق مزید تفصیلات جب حمیر کے بھائی نے ممی کے گوش گزار کیں تو ان کے چہرے کے تاثرات ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ ماہا کی شادی جلد از جلد کردینا چاہتی تھیں اور اس کے لیے انہیں رشتے کی بھی تلاش تھی۔ مگر وہ ان کی اولاد تو تھی نا' جلدی کی خواہش رکھنے کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کسی اچھی جگہ ہو اور یہ تو واقعی ایک بہترین رشتہ نظر آرہا تھا۔

جواد رضا' حمیر کی تصویر اور اس کا وزیٹنگ کارڈ انہیں دے گئے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے تھے کہ وہ یہ رشتہ جلدی طے کردینا چاہتے ہیں۔

مظہر انکل جنہوں نے اس کے رشتے کے لیے آنے والوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا انہوں نے رات کے کھانے پر ممی سے اس بارے میں پوچھا ضرور تھا۔ اور ممی نے جیسے ہی انہیں حمیر کے متعلق تمام تفصیلات بتائیں اس نے ان کے چہرے پر جلن اور حسد جیسے تاثرات دیکھے۔ اسے ان کے چہرے پر دکھائی دیتی جیلسی سے دکھ پہنچا تھا اتنے برسوں میں انہیں اس سے اتنی سی بھی انسیت نہیں ہو سکی تھی کہ اس کی کسی خوشی پر خوش ہو سکیں؟

ممی تو اس کی شادی کل کی کرتی آج کردیتیں پھر یہ تو ایک بہترین رشتہ تھا۔ انہوں نے حمیر کے بارے میں کسی بھی طرح کی کوئی انکوائری یا معلومات کروائے بغیر بس ایک دفعہ اس کے گھر جا کر اس سے ملنے کے بعد اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی۔

باقاعدہ کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی بس بات پکی کر کے شادی کی تاریخ طے کرلی گئی تھی۔ اسے بہت عجیب عجیب سے خیال آتے' اسے آنے والے وقت سے بہت ڈر لگتا' وہ کیسا تھا' وہ کس طرح کی عادتوں کا مالک تھا' وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز جس لڑکے کی ذہانت کے قصے ہمہ وقت سناتے تھے کیا ضروری تھا کہ وہ عادتوں اور مزاج میں بھی اچھا ہوتا؟

بات طے ہو جانے کے بعد حمیر نے صرف ایک

مرتبہ اس سے فون پر رابطہ کیا تھا اور اس میں بھی ان دونوں کی بہت مختصر بات ہوئی تھی۔

"اب تو یقین آگیا کہ جس لڑکی کا راستہ میں نے کیمپس میں روکا تھا میں اس کے ساتھ وقت نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"آپ نے مجھے' میرا مطلب اتنا بڑا فیصلہ' آپ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے پھر یہ سب۔" وہ اس کی شوخی کے جواب میں سنجیدگی سے بولی۔

"اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے جو کچھ کہنا پڑے گا' وہ ابھی کہنا مناسب نہیں۔ اس سوال کا جواب میں تمہیں ۲۶ فروری کو اپنے گھر میں۔ سوری تب تو وہ ہمارا گھر ہو چکا ہو گا تو میں ہمارے گھر میں ۲۶ فروری کو تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا اور وہ اس مختصر سی بے تکلفانہ گفتگو کے بعد بھی اپنے اندر کے ڈر اور خوف کو دور نہیں کر پائی تھی۔

وہ زندگی میں تیسری بار ایک گھر کو چھوڑنے والی تھی جس گھر میں اب وہ جا رہی تھی کیا وہ گھر واقعی اس کا گھر ہو گا؟ کیا وہ شخص واقعی ویسا ہو گا جیسا دکھتا ہے؟ آگے کیا ہونے والا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بس ایک جوا کھیل رہی تھی اور اگر وہ سب کچھ ہار گئی تو اس کے پاس تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر میکے نام کا آسرا بھی نہیں ہو گا۔

اس کی شادی کی تقریبات میں مہندی' مایوں کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر وہاں حمیر ان رسومات کے خلاف تھا تو یہاں اتنا فالتو پیسہ کسی کے پاس نہیں تھا کہ ان اللوں تللوں میں خرچ کرتا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد اتنے ہی پیسے بچے تھے کہ اس کی اس عام سے انداز میں شادی ہو سکے۔ بہت عام سا ہی اس کا جہیز تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد اب پیچھے اگر ماں اور اس کا گھر نہیں تھا تو باپ کا ترکہ بھی سب تمام ہو گیا تھا۔ شادی کے دن وہ اپنے پاپا کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ اگر وہ ہوتے تو اس کی ذہانت اور اس کی تعلیم پر کتنا خوش ہوتے' اس پر فخر کرتے۔ آج اس کی شادی کے دن اسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر وہ کبھی مسکراتے اور کبھی اس کی جدائی پر آنسو بہاتے۔

وہ رخصت ہو کر حمیر رضا کے ساتھ اس نئے گھر میں آگئی۔ حمیر کے بھائی' بھابھی' ان کے بچے اور حمیر کے چند قریبی دوست رخصتی کے بعد اس کے اپارٹمنٹ میں ان دونوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ سب کچھ دیر ان دونوں کے ساتھ رہے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ سب جانے کے لیے اٹھنے لگے۔ پہلے حمیر کے دوست رخصت ہوئے اور پھر رات دو بجے بھائی بھابھی اور ان کے پانچوں بچے بھی جانے کے لیے اٹھ گئے۔ حمیر نے رسماً "بھی جواد بھائی اور ان کی فیملی کو" رات یہیں رکنے کی دعوت نہیں دی۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی' پھر بھی اسے حمیر کے غیر جذباتی پُرتکلف اور رسمی انداز گفتگو پر حیرت ہوئی۔ اتنے دنوں کی اعصاب شکن صورت حال' خوف' اندیشے ان سب سے نڈھال ہو چکی تھی اور اب جب وہ بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی تھی تو اسے ایسا لگا کہ اب خوف اور اندیشے پالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے خود کو پرسکون اور مطمئن کرنے کی کوششیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ حمیر چند لمحوں ہی میں جواد بھائی اور ان کی فیملی کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔

آج سب لوگوں نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ کلثوم اور صنم نے خاص طور پر دلہن بنے اس کے روپ کو دل کھول کر سراہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی جو اس پر نظر ڈالنے والے کسی بھی شخص کو دوسری نظر ڈالنے پر مجبور کیا کرتی تھی۔ صنم کو یقین تھا کہ آج حمیر اس کے حسن کی شان میں ایک آدھ غزل نہیں بلکہ پورا دیوان کہہ ڈالے گا۔ اور حمیر نے نہ غزل کہی نہ دیوان۔ اس نے اس کی تعریف بے شک بہت کی۔ کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں جیسی خوبصورت تھی آج اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت

ـت لگ رہی ہے۔ مگر اس کی ماہا سے شادی کی وجہ ـ کی خوبصورتی سے زیادہ اس کی ذہانت تھی۔ وہ اس ـ ذہانت سے متاثر ہوا تھا۔ اسے اس کے بات کرنے ـ انداز اچھا لگا تھا۔

"میں کبھی کسی ایسی لڑکی سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا ـ کے پاس حسن تو ہو پر ذہانت نہ ہو۔ ہر نارمل انسان ـ طرح خوب صورتی مجھے بھی متاثر کرتی ہے مگر ـ اسے بنیاد بنا کر میں کسی لڑکی کو شادی کے لیے ـ نہیں کر سکتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ اللہ نے ـ میرے نصیب میں دونوں ایک ساتھ لکھ دی تھیں ـ ایسی لڑکی مل گئی جو بے تحاشا خوب صورت بھی ـ اور بے انتہا ذہین بھی۔" اس کی انگلی میں ڈائمنڈ ـ پہناتے ہوئے حمیر نے کہا تھا۔

"جب تم ڈاکٹر اعجاز کے آفس میں آئیں تو میں نے ـ ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں ان سے جو ـ کرنے گیا تھا وہ کر چکا تھا اور جب تم آئیں تو وہاں ـ اٹھنا ہی چاہ رہا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ میں وہاں سے ـ نہیں پایا۔ تم نے محض پانچ منٹ میں ہی مجھے اپنی ـ اس طرح متوجہ کر لیا کہ میں وہاں بیٹھا رہنے کے ـ اور کچھ کر نہیں پایا۔

ـمہارے بولنے کا خوب صورت انداز۔ ایک تو ـ اتنی پیاری اوپر سے لہجہ ایسا دلنشین۔ مجھے کبھی ـ لڑکی نے اس طرح متاثر نہیں کیا تھا۔ میں وہیں ـ بیٹھے تم سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تب ہی تم ـ نوعیت کے وہ سوالات پوچھے تھے جنہیں سن ـ رے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی اور پھر اسی ـ کے ساتھ تم گفتگو ادھوری چھوڑ کر جب ایک ـ وہاں سے اٹھیں تو میرا دل چاہا تھا میں تمہارا ہاتھ ـ تمہیں روک لوں۔ "ماہا تم کہیں مت جاؤ۔ بس ـ یس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہو۔ میں ـ دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں سنتے رہنا چاہتا ـ اس وقت اگر میں واقعی ایسا کر جاتا تو تم میرے ـ سلوک کرتیں؟" متبسم نگاہوں سے اسے ـ ہوئے اس نے پوچھا۔ لہجے کی شرارت یہ بتا رہی

تھی کہ وہ اس کے ممکنہ ردِعمل کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کر انجوائے کر رہا ہے۔ جو وہ کرتی اسے سوچ کر اب اس وقت' اس جگہ بیٹھ کر اسے خود بھی ہنسی آنے لگی تھی' جسے اس نے بمشکل کنٹرول کیا تھا۔ "اگلے روز مجھے انسٹی ٹیوٹ میں دیکھ کر جو تاثرات تمہارے چہرے پر آئے تھے انہیں دیکھ کر مجھے واقعی ایسا لگا تھا جیسے میں کوئی سڑک چھاپ لفنگا ہوں' جو خواہ مخواہ ایک شریف لڑکی کو تنگ کیے چلا جا رہا ہے۔ ویسے اس روز میں کسی سیمینار میں نہیں' صرف تمہاری خیریت ہی پوچھنے آیا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور اس بار وہ اپنی مسکراہٹ اس سے چھپا نہیں پائی تھی۔

ایک انجانے سے خوف کی جس مسلسل کیفیت میں وہ گھری تھی دھیرے دھیرے اس سے نجات پانے لگی تھی۔

اگلے روز ان کا ولیمہ ہوا تھا۔ ولیمے کی تقریب میں گو کہ مہمانوں کی تعداد بہت کم تھی مگر وہ تقریب تھی بہت شاندار۔ جواد بھائی اور ان کی فیملی کے سوا' حمیر کے خاندان کا کوئی فرد اس تقریب میں موجود نہیں تھا۔ مہمانوں میں سب اس کے کولیگز' اس کے قریبی دوست اور دیگر ملنے ملانے والے شامل تھے۔ اسے یہ بات بہت عجیب لگی۔ مگر صرف ایک دن میں وہ حمیر سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ اس بارے میں کچھ پوچھ پاتی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو حمیر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا ٹائی باندھتا نظر آیا۔ وہ چونک جانے والے انداز میں یک دم اٹھ بیٹھی۔ اپنی شادی کے تیسرے دن وہ صبح صبح اتنے اہتمام سے تیار ہو کر کہاں جا رہا تھا؟

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"تم یہ آپ آپ کر کے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری بیوی نہیں' بلکہ میری کوئی کولیگ مجھ سے مخاطب ہے۔" اسے اٹھ کر بیٹھتا دیکھ کر وہ فوراً ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹا اور پھر اس کے پاس آتے ہوئے اس طرزِ تخاطب پر اپنے

اعتراض کا برملا اظہار کیا۔
"ویسے میں بینک جارہا ہوں۔ یعنی اپنے آفس۔"
"آفس؟" اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔
"نہیں جاؤں؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔
"نہیں، میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" وہ اسے اتنا قریب بیٹھتے دیکھ کر تھوڑا دور ہٹی۔ وہ اگر قریبی دوستوں کے سوا دوسرے لوگوں سے پر تکلف طریقے سے اور فاصلے رکھ کر ملا کرتی تھی تو یہاں گڑبڑیہ تھی کہ حمیر رضا "لوگ" نہیں اس کا شوہر تھا اور وہ اس کے پُر تکلف انداز کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا، اسی لیے جیسے ہی وہ دور ہٹی اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے دوبارہ اپنے اتنا ہی قریب کرلیا جتنی وہ پہلے تھی۔
"خاتون! اب آپ مس ماہا احمد علی نہیں کہ مجھ سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھیں اور میں دیکھتا رہوں، اب آپ مسز ماہا حمیر رضا بن چکی ہیں اور یہ بات آپ کو یاد رہنا چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

وہ دن اور اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا تھا۔ وہ صبح تیار ہو کر آفس چلا جاتا اور پھر شام ساڑھے چھ اور سات کے درمیان اس کی واپسی ہوتی اور دن بھر میں صرف ایک بار اس نے ماہا کو فون کیا، تیسرے دن وہ اسے اپنے ساتھ لے کر اسلام آباد آگیا۔ یہاں اسے کوئی میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی اور غالباً "کسی ورک شاپ یا سیمینار میں بھی شرکت کرنی تھی۔ یہ ہنی مون کی کون سی قسم تھی وہ جانتی نہیں تھی۔ پورے تین دن وہ ہوٹل میں سارا سارا دن اکیلے رہ کر اپنا ہنی مون مناتی رہی۔ اور چوتھے دن جب اسے لگا کہ اب وہ اس بندے کی ان نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کو مزید برداشت نہیں کرسکتی، تب وہ صبح سویرے اس سے سامان پیک کرنے کا کہنے لگا۔
"ہم ایبٹ آباد، سوات اور گلگت جارہے ہیں۔"
"وہاں پر بھی کوئی میٹنگز ہیں کیا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ قہقہہ لگا ہنس پڑا تھا۔
"ہاں، ایک لڑکی ہے ماہا حمیر رضا اس کے ساتھ اگلے دس دنوں تک، چوبیس گھنٹے میری میٹنگز رہیں گی ان تمام جگہوں پر۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اپنی زندگی کے اگلے سات آٹھ سالوں تک کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اس میں شادی جیسی کسی چیز کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اگلے آٹھ سالوں تک میرا شادی کرنے کا سرے سے کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ مگر آٹھ سالوں بعد جب میں شادی کرنے کا سوچتا تب ماہا احمد علی مجھے مل بھی پاتی، اس کی کیا گارنٹی تھی؟ لڑکی مجھے دیکھتے ہی آنکھیں ماتھے پر چڑھا لے، تیور پر بل ڈال لے۔ کیا اس سے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ۔
"سنو ماہا! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ابھی نہیں، آٹھ سال بعد۔ کیا تم آٹھ سالوں تک میرا انتظار کرسکتی ہو؟" سوات میں اس کے ساتھ گھومتے ہوئے حمیر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ "میں تم ہی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر ابھی نہیں، سات آٹھ سال بعد۔ میرے کیریئر کی شروعات ہے میں اس وقت شادی سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر ڈر مجھے یہ لگا کہ جب میں شادی کرنے کی پوزیشن میں آجاؤں گا تب یہ نجانے کہاں کھو چکی ہوگی۔ مجھے تمہیں کھو دینے لاحق تھا اور اس ڈر نے میری ساری پلاننگز کا بیڑہ کرکے مجھ سے قبل از وقت شادی کا فیصلہ کروایا۔
"مجھے ان پلاننگز کے ناکام ہو جانے پر خوشی محسوس کرنا چاہیے یا افسردگی کا؟"
"تمہاری مرضی ہے۔ ویسے تم اس بات پر تو فخر بھی محسوس کرسکتی ہو کہ ایک ایسا شخص جس میں شادی سے ہٹ کر ابھی اور بہت سے کام تھا، تم نے اس سے باقی سب کاموں سے پہلے

ہمہ کروالیا اور وہ بھی بالکل "آنا" فانا"۔" اس کے شوخی بھرے سوال کے جواب میں وہ مصنوعی سنجیدگی سے مسکراہٹ لبوں پر روکتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں بات فخر کرنے والی ہے بھی یا نہیں۔ دنیا میں ایک میں اکیلی ذہین لڑکی تو نہیں۔ اگر کسی دن کوئی مجھ سے زیادہ ذہین لڑکی مل گئی تو میں اور میرا فخر تو منہ تکتے رہ جائیں گے۔" اپنی شادی شدہ زندگی کے ان چند دنوں میں ان کے درمیان بہت سے موضوعات پر بہت ساری باتیں ہوئی تھیں، مگر وہ ایک لفظ جو اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا ایک بار بھی درمیان میں نہیں آیا تھا۔ وہ خوب صورتی سے متاثر نہیں ہوا تھا تو ذہانت سے ہو گیا تھا اور محبت؟ یہ ایک لفظ وہ بڑی شدت سے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کے جواب میں چھپے مفہوم کو سمجھ بھی گیا تھا تب ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟"

"ہاں۔ ورنہ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جس بندے کو میں آفس، آفس اور کام، کام اور کام میں مصروف دیکھ رہی ہوں اس کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے؟" ابتدا" جس جھجک اور تکلف کو وہ محسوس کر رہی تھی اب آہستہ آہستہ اس کے حصار سے نکلتی جا رہی تھی۔ اس کی وہ تنہائی جسے وہ بچپن سے جھیلتی آئی تھی یک دم ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس کی تنہائیاں بانٹنے ہر وقت کوئی اس کے ساتھ تھا اور اس کے لیے یہ بڑا انوکھا اور دلفریب احساس تھا کہ جو شخص اس کے ساتھ ہے وہ اس پر بلا شرکت غیرے پورا حق رکھتا ہے۔ اور حق رکھنے والا یہ احساس از خود ہی اس کے اندر پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اپنی زندگی کے اتنے برسوں تک رشتوں اور محبتوں سے محروم رہنے والی لڑکی کو اچانک ہی ایسا لگنے لگا تھا جیسے اسے سب سے زیادہ اپنا کہہ سکنے والا ایک رشتہ اور پورا حق رکھنے والی ایک بھرپور محبت مل گئی ہے۔ اور زندگی سے کیا چاہا تھا ماہا احمد علی نے؟

"میری زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہے ماہا! اور اگر محبت کا اظہار لفظوں سے کرنا ضروری ہوتا ہے تو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا! تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔" اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے محبت اور چاہت سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گلگت میں تھے اور سخت ترین سردی میں وہ اپنے کمرے میں ہیٹر آن کیے کمبل میں گھس کر بیٹھے ہوئے ڈرائی فروٹس کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ آج وہ قدرے سنجیدہ موضوعات پر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ بہت تیز رفتار اور بہت بھاگتی ہوئی زندگی گزارنی پڑے گی۔ میں زندگی کو جیسی ہے اور جہاں ہے کی بنیاد پر نہیں گزار سکتا۔ میں ابھی زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے کیریئر کی ابتدا ہے ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ کیا تم میری رفتار کا ساتھ دے سکو گی؟" اس نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ کیسی عجیب سی بات تھی جس شخص کے سنگ زندگی کا نیا سفر شروع کرتے ہوئے وہ بے شمار اندیشوں اور وسوسوں کا شکار تھی اب اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے ان اندیشوں اور وسوسوں پر ہنس رہی تھی۔ اسی رات حمیر نے اسے اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق بھی سب کچھ بہت سچائی اور ایمانداری سے بتایا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر اور اپنے بچپن کی کوئی بات اس نے ماہا سے نہیں چھپائی تھی۔ اسے حمیر کی صاف گوئی اور سچائی نے بے انتہا متاثر کیا تھا۔

اس جیسے مہذب بندے کے بارے میں کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جہاں اعلا تعلیم تو کیا عام سی تعلیم حاصل کرنے کا بھی رواج نہیں تھا۔ اس کی والدہ لکھنا پڑھنا کچھ نہیں جانتی تھیں اور والد بھی بس واجبی ہی سے تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے والد کسی مل میں ایک معمولی سے ملازم

تھے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے گھر میں غربت اور کسمپرسی والے حالات دیکھے تھے۔ ایسے حالات کے جہاں سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جواد بھائی اس سے سولہ سال بڑے تھے اور صرف اپنے دو بچوں کا خرچ اٹھانا ہی اس کے والد کے لیے اپنی محدود آمدنی کے سبب سخت دشوار تھا۔ انہوں نے اسے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروایا تھا مگر سرکاری اسکول میں اسے تعلیم دلانا بھی ان کی استطاعت سے باہر ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنی والدہ کو اپنے بچپن ہی سے بیمار دیکھا تھا۔ مگر ان ماحول اور ان حالات میں وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وظیفے حاصل کرتے رہنے کے سبب اپنی تعلیم کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھتا رہا۔ وہ اس ماحول میں اتنا مختلف کیسے پیدا ہو گیا تھا' یہ تعجب کی بات تھی' مگر سچ یہی تھا کہ وہ گدڑی کا لعل تھا۔ اس کی قدرتی ذہانت اور قابلیت اسے اپنے ماحول سے الگ [illegible] رہا کرتا تھا تو اس کی والدہ اور بارہ [illegible] تھا۔ اسے میرٹ [illegible] کے ساتھ [illegible] رت [illegible] شنز [illegible] قدرتی ذہانت تو تھی باقی مدد اس نے اپنی آپ کی تھی۔ وہ مکمل سیلف میڈ تھا۔

اب جس لب و لہجے میں وہ روانی سے انگریزی بولتا تھا اسے سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی گورنمنٹ اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ اس کے مینرز' اس کے ایٹی کیٹس' اس کی گفتگو' اس کا اٹھنا' بیٹھنا' ان سب کو اس نے خود محنت کر کے سنوارا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "جس انسان کے پاس کچھ کر گزرنے کا عزم ہو' ذہانت ہو' قابلیت ہو' خود پر اعتماد ہو تو پھر اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" وہ صرف انٹر کرنے تک جواد بھائی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا راستہ ان سے الگ کر لیا تھا۔ اسے ان کے زندگی گزارنے کے طریقہ' محدود سوچ اور گھٹے ہوئے ماحول والے گھر سے الجھن ہوتی تھی۔ نہ ان میں آگے بڑھنے کی جستجو تھی اور نہ ترقی کرنے کی لگن۔ تعلیم چلو اگر انسان زیادہ حاصل نہ بھی کر پایا ہو تب بھی اپنے لیے محنت اور کوشش کے ذریعے ترقی کی راہیں کھول سکتا ہے۔ مگر وہ تو کنویں کے مینڈک کی طرح اپنے حال میں مگن بڑے خوش تھے۔ بڑا تیر مارا تھا انہوں نے تو کپڑے کی مل کی نوکری چھوڑ کر اپنی بیوی کے بھائیوں کے ساتھ شراکت داری کر کے کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ لیاقت آباد میں کرایہ کی دکان اور شراکت داری والا محدود سا کاروبار۔ وہ انہیں ایک ناکام انسان کہتا تھا۔ محدود آمدنی' محدود وسائل' پانچ بچوں کے اخراجات' نہ کوئی اسٹیٹس نہ کوئی اسٹینڈرڈ' جواد بھائی کے گھر کو چھوڑنے کے بعد وہ اندرون سندھ سے آئے اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک کمرے کے فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔

اس نے کوئی آسان زندگی نہیں گزاری تھی۔ وہ محنت کر کے' سختیاں جھیل کر اور کڑی مشکلات سے گزر کر اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن یہ مقام اس کی نگاہوں میں کافی نہیں تھا۔ ابھی اسے آگے جانا تھا' بہت آگے۔ اسے ترقی کرنی تھی' بہت ترقی۔ ابھی جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا وہ تو اس کی نگاہوں میں آغاز تھا۔ ترقی اور کامیابی کی شاہراہ پر اس کا پہلا قدم۔ آگے ایک لمبا اور دشوار سفر تھا۔ وہ زندگی میں ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پروفیشن میں کامیابی کی آخری حدوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک ملکی و بین الاقوامی سطح پر کامیاب سمجھا جانے والا قابل اور ماہر بینکر۔ ڈیفنس کے جس فیز میں وہ دو کمروں کے کرایہ کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا' وہ وہاں نہیں بلکہ ڈیفنس کے سب سے بڑے آئی پی فیز میں اپنے ذاتی دو تین ہزار گز کے بنگلے میں رہنا چاہتا تھا۔ جو گاڑی وہ ڈرائیو کرتا تھا' وہ دوسروں کو شاید اچھی لگتی ہو مگر اس کے معیار کے حساب سے وہ اچھی نہیں' بس صرف گزارے لائق تھی۔ وہ معمولی چیزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے والا انسان نہیں تھا۔ اسے حمیر کا ترقی اور کامیابی کی انتہائی منزلوں کو چھو لینے والا

جب اس لیے اچھا لگا کہ اس کے حصول کے لیے وہ ت کرنے کی بات کر رہا تھا' کسی غلط راستے پر چلنے کی یں۔ اس کے سب خواب اس نے اپنی پلکوں پر سجا ے تھے۔ جب اس شخص کو دل و جان سے اپنا لیا تھا تو ے کے خوابوں کو کیوں نہ اپناتی۔

وہ ماہا کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنی سوچوں کے ف جلدی شادی کرنے پر تو مجبور ہو گیا تھا لیکن چند سالوں تک وہ اپنی فیملی میں اضافہ نہیں چاہتا ر یہ بات اس نے ماہا سے اسی رات ہی کافی سنجیدگی سے کہی تھی۔

"بچوں کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے ماہا! ماں پ کا کام صرف انہیں پیدا کرنا نہیں بلکہ انہیں ترین رہائش' بہترین آسائشیں اور بہترین تعلیم دینا ہوتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو ویسا بچپن اور ویسی نہیں دینا چاہتا جیسی میرے ابا جی نے مجھے دی۔ اپنے بچوں کو ایک بہترین زندگی دیں گے ماہا! مگر اس لیے ہمیں چند سال انتظار کرنا ہوگا۔" اس نے حمیر یہ بات بغیر کسی اختلاف کے فوراً" مان لی تھی۔ ت کی ایسی مضبوط ڈور اس شخص کے ساتھ بندھی کہ اسے لگتا وہ اس کی کوئی بات کبھی رد کر ہی نہیں تھی۔ وہ ایک شخص' وہ ایک رشتہ' وہ ایک محبت' کی زندگی اب اس محور سے کبھی ہٹ نہیں سکتی ۔

دس دن ان دونوں نے ساتھ یوں گزارے جیسے ن دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کسی بھی شخص اور بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ اس کے ساتھ بہت گھومی' بہت انجوائے کیا اور وہ ہر پل اپنے رویوں سے اسے اپنی محبت کا بھرپور انداز میں احساس دلاتا ۔

☼ ☼ ☼

نی مون سے لوٹے تو زندگی صرف گھومنے پھرنے انجوائے کرنے والے دور سے نکل کر اپنے معمول ۔ ان کی شادی سے مہینہ بھر پہلے ہی حمیر اس نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا تھا' اس لیے ابھی اپارٹمنٹ پوری طرح فرنشڈ اور ڈیکوریٹڈ نہیں تھا۔ وہ حمیر سے وہاں کا کرایہ سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اگر وہ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو سمجھ نہ گئی ہوتی تو یہ ضرور کہتی کہ یہاں کے بجائے وہ کسی سستے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے؟

وہ جہیز میں جو فرنیچر لائی تھی' وہ اس جگہ کے شایان شان نہیں اور نہ ہی حمیر کے معیار کے مطابق ہے' یہ بات وہ خود بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ حمیر نے اس کی اجازت سے وہ سارا فرنیچر فروخت کر کے نیا قیمتی اور خوب صورت فرنیچر خرید لیا تھا۔ نیا فرنیچر خریدنے میں سارے پیسے تو حمیر ہی کے خرچ ہوئے تھے۔ حمیر کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس نئے فرنیچر کے وہاں سج جانے پر بہت خوش تھی۔ اپنے گھر کی پہلی پہلی سجاوٹ اسے خوشی کے ساتھ فخر میں بھی مبتلا کر گئی تھی۔ ماہا احمد علی کو پورے حق کے ساتھ اپنا کہہ سکنے والا ایک گھر آخر کار مل ہی گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جس طرح حمیر نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بالکل سچائی سے بتایا تھا' اسی طرح اس نے بھی اسے پوری سچائی سے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سب جو کبھی کسی سے شیئر نہیں کر پائی تھی۔ دوستوں کے سامنے بھرم قائم رکھنے کو وہ ممی کی محبت' مظہر انکل کا التفات اور بھائی بہن کی چاہت کے جھوٹے قصے گھڑا کرتی تھی' مگر اس شخص کے سامنے اسے جھوٹی عزت اور جھوٹا بھرم قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ساری دنیا میں اس کا سب سے زیادہ اپنا تھا۔ وہ کسی بھی طرح کی شرمندگی محسوس کیے بغیر اس سے اپنا ہر دکھ کہہ سکتی تھی۔

"تمہیں ایسی بیوی ملی ہے جو کبھی میکے جایا ہی نہیں کرے گی۔ شوہروں کو بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے نا' جب بیویاں میکے جاتی ہیں۔ تمہیں یہ احساس کبھی نہیں مل سکے گا۔" اس کے کندھے پر سر رکھ کر اس

نے آنسو بہائے تھے' اپنے سارے دکھ اس سے کہے تھے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کیے تھے۔ رو رو کر جب وہ اپنا دل ہلکا کر چکی تو ماحول کی اداسی دور کرنے کی خاطر قصداً" شرارتی انداز میں یہ بات اس سے کہہ گئی۔

"تم اگر مجھ سے دور جاؤ گی تو مجھے آزادی کا نہیں بلکہ گھٹن کا احساس ہوگا۔ اچھا ہے کہ تم اپنی ممی کے گھر نہیں جایا کرو گی' ورنہ اور کسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوتا یا نہیں' تمہارے وہاں جانے پر ضرور ہوا کرتا۔ میں تمہیں خود سے دور اب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتا۔"

وہ اسے اپنی محبتوں کا یقین دلا رہا تھا اور وہ سرشار سی ہوتی اس کے بازو پر سر رکھ کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

انہیں اپنی روٹین لائف پر آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے' جب ماہا کا رزلٹ آگیا۔ اپنی توقع کے عین مطابق وہ بڑے شاندار اور نمایاں انداز میں کامیاب ہوئی تھی۔ حمیر نے اس کی کامیابی کو بڑے جوش و خروش سے سیلیبریٹ کیا تھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھا بلکہ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہے۔ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھاڑ اس نے وہ ساری شام ماہا کے نام کردی تھی۔ ساری شام وہ دونوں ساتھ رہے تھے پھر رات میں حمیر نے اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں شاندار ڈنر کروایا اور گفٹ میں اسے وائٹ گولڈ کی چین دی جس میں ڈائمنڈز سے سجا لاکٹ تھا۔ یہ گفٹ بے شک بہت قیمتی تھا مگر اس کی اصل قیمت یہ تھی کہ حمیر نے یہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے احساس پایا تھا کہ اپنی خوشیاں وہ کسی کے ساتھ بانٹ بھی سکتی ہے' کوئی اور بھی ہے جو اس کی کامیابیوں اور اس کی خوشیوں کو اپنی کامیابیاں اور اپنی خوشیاں سمجھ کر بے تحاشا خوش ہو سکتا ہے۔

ڈنر کرنے کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک سمندر کے کنارے گھومے تھے۔ اگلے روز چھٹی کا دن تھا' اسی لیے بے فکری سے رات گئے تک جاگ کر انہوں نے ماہا کی پسند کی مووی دیکھی تھی۔

اگلی صبح وہ دونوں بارہ بجے سو کر اٹھے تھے۔ انہوں نے ناشتہ اور لنچ ایک ساتھ مل کر کیا تھا۔ وہ برتن دھونے میں مصروف تھی جب حمیر نے اسے آواز دے کر بلایا۔

"کیا بات ہے حومی؟" اسے حومی کہنا ماہا کو اچھا لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب وہ اسے اس نام سے بلاتی ہے تو دل میں محبت اور قربت کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے۔

وہ اپنے سامنے پھیلے انگریزی اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔

"یہ دیکھو' میں نے تمہارے لیے کتنی زبردست چیز تلاش کی ہے۔" وہ فلور کشن پر اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور پھر پوری طرح اخبار پر جھک کر اس اشتہار کو دیکھنے لگی جس پر حمیر نے انگلی رکھی ہوئی تھی۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو فریش MBAs کیے ہوئے Trainees کی ضرورت تھی۔ اس اشتہار کے علاوہ حمیر نے تین اور اشتہارات پر بھی نشان لگا رکھا تھا جن میں ایک اشتہار لوکل کمرشل بینک کا بھی تھا مگر وہ زیادہ ایکسائیٹڈ اس پہلے والے اشتہار ہی کے بارے میں تھا۔

"تم یہاں اپلائی کرو ماہا! اگر تمہیں یہاں جاب مل گئی تو مزا آجائے گا۔ اتنے شاندار کیریئر والی جاب اور اتنا بہترین سیلری پیکج۔" وہ اس کی ایکسائٹمنٹ پر ہولے سے مسکرائی۔

"حومی! جاب تو بہت اچھی ہے لیکن نائن ٹو فائیو والی جاب کیا اب میں کرپاؤں گی؟ میں اپنے گھر کو تو تمہیں اگنور نہیں کرنا چاہتی۔ صبح تم آفس جاؤ تو میں تمہیں دروازے تک جا کر بڑے اہتمام سے رخصت کروں اور جب شام میں واپس آؤ تو تمہارے لیے بہت اچھا سا کھانا پکا کر رکھوں اور خوب اچھی طرح تیار ہو کر سج سنور کر تمہارا دروازے ہی پر استقبال کروں۔"

"تو کیا ماہا احمد علی نے MBA کرنے کی منت

لیے اٹھائی تھی کہ وہ شادی کے بعد آج آلو گوشت یا گوبھی گوشت' جیسی سوچوں میں اپنا وقت گزارا کریں گی؟ اگر یہی کرنا تھا تو بی اے بلکہ انٹر بھی تمہارے لیے کافی رہتا۔" وہ دادا ابا والے اس کے خفگی سے بھرپور لہجے پر کھل کر مسکرائی تھی۔

"میں آلو گوشت اور گوبھی گوشت کے علاوہ دوسرے سالن پکانے کے متعلق بھی سوچا کروں گی' فکر مت کرو۔" پھر اسے تنبیہی نگاہوں سے گھورتا دیکھ کر وہ بھی قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں گھر میں بیٹھی رہوں گی۔ میرا مطلب تھا' میں کوئی ہلکی پھلکی سی جاب کرلوں' ٹائم پاس کرنے والی۔ مجھے کسی کیریئر Oriented جاب کی طرف جاکر اور کسی سنجیدہ و محنت طلب کیریئر کو اپنا کر اپنے گھر کو بالکل اگنور نہیں کرنا۔ کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟"

"صرف غلط نہیں بلکہ ایک دم بکواس ہے۔ اتنی اچھی ڈگری حاصل کرکے چھوٹی موٹی جاب کروگی؟ اتنی محنت کی ہے' اتنا پڑھا ہے تو اس کا کچھ ریٹرن بھی تو تمہیں اس کو حاصل کرنا چاہیے۔ آئی بی اے سے ایم بی اے کی ہوئی لڑکی' وہ بھی اتنے شاندار گریڈز کے ساتھ' کیا کوئی معمولی سی چند ہزار روپوں والی جاب کرتی اچھی لگے گی؟ انسان کو اپنے کیریئر کے اسٹارٹ میں خوب سوچ سمجھ کر صحیح راستے پر قدم رکھنا چاہئیں۔ جہاں میں کہہ رہا ہوں' وہاں جاب کرنے سے تمہارا کیریئر بنے گا احمق لڑکی!

تمہاری جیسی ٹیلنٹڈ لڑکی جاب اور گھر سب کچھ ساتھ لے کر چل سکتی ہے پھر ہم گھر میں افراد ہی کتنے ہیں؟ صرف دو۔ ہمارے گھر کا ایسا کوئی کام نہیں جس پر تمہارے صبح سے شام تک گھر میں موجود نہ ہونے سے کوئی فرق پڑے گا۔ اگر تمہارا کیریئر صحیح ٹریک پر چل پڑا تو چند سالوں میں تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گی۔"

"اچھا بابا' تم جیتے میں ہاری۔" وہ اس کے مضبوط دلائل سے بھری لمبی تقریر کے جواب میں مسکرا کر بولی۔ "ویسے ہم اس طرح بات نہیں کررہے جیسے جاب مجھے آفر ہو چکی ہے۔ بس اب اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں ٹیسٹ میں ہی فیل ہو جاؤں یا وہ انٹرویو ہی میں مجھے ریجیکٹ کردیں اور انڈوں کی ٹوکری ہمارے سر پر سے گر جائے۔"

"ناممکن' ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس کے شرارتی انداز کے جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتا سنجیدگی اور بہت یقین کے ساتھ بولا۔ "حمیر رضا بھی کسی جگہ فیل نہیں ہوا تو اس کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟"

☼ ☼ ☼

حمیر نے اس سے جہاں جہاں کہا تھا' اس نے ان تمام جگہوں پر اپلائی کر دیا تھا۔ اس کے پاس انٹرویو کے لیے کالز آنا بھی شروع ہو گئی تھیں۔ حمیر کو زیادہ شدت سے اس کمپنی سے کال کا انتظار تھا پھر آخر کار وہاں سے بھی اس کے پاس کال آگئی۔ تب تک وہ تین جگہوں پر انٹرویوز دے کر آچکی تھی اور ان میں سے ایک جگہ سے تو اسے جاب مل جانے کی نوید بھی مل چکی تھی حمیر ٹیسٹ اور انٹرویو کی تیاری کے سلسلے میں اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس نے خود ساتھ بیٹھ کر اسے ان دونوں چیزوں کی تیاری کروائی تھی۔

"حومی! میں بور ہو گئی ہوں' تمہارے منہ سے یہ خشک باتیں سن سن کر۔ کتنے دنوں سے تم نے نہ مجھے یہ بتایا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو اور نہ یہ کہ میری براؤن آنکھوں کی طرف دیکھنے کے بعد تم باقی ہر بات بھول جاتے ہو۔" ڈھیر ساری کتابیں سامنے سے ہٹا کر ناز بھرے انداز میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

"تم زیادہ سیریس نہیں لگ رہی ہو مجھے' بس اس لیے ڈر رہا ہوں کہ کہیں تم وہاں کچھ گڑبڑ نہ کر آؤ۔" اس نے اس کی غیر سنجیدگی اور غیر دلچسپی پر اسے سرزنش کی۔

"اچھا اب تم سنجیدہ ہو جاؤ اور دور ہٹ کر بیٹھو۔" ماہا اس کے کندھے سے سر ہٹا کر فوراً سنجیدہ ہو کر بیٹھ

گئی۔ وہ اسے لیٹ ڈاؤن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ماہا یہ جاب حاصل کرے تو وہ اسے حاصل کرلینا چاہتی تھی۔

اور پھر اس نے حمیر کو لیٹ ڈاؤن کیا بھی نہیں تھا۔ تحریری امتحان اور انٹرویو' وہ دونوں مراحل میں سرخرو ہوئی تھی۔ تین مہینوں کا ٹریننگ پیریڈ بہت بھاگتے دوڑتے اور مصروف گزرا تھا۔ اسے اپنے آفس میں ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا کہ وہ وہاں مستقل ملازمت کی حقدار قرار پاسکے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اسے بے تحاشا محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

ماہا کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہوجاتی تھی۔ وہ ایک مہینے کچھ بچت کر بھی لیتی تو اگلے مہینے گھر کے لیے کسی نئی چیز کے خرید لینے پر وہ بچت خود بخود ہی ٹھکانے لگ جاتی۔

ان دونوں نے زیرو سے اسٹارٹ کیا تھا' اس سے شادی سے پہلے تک تو حمیر دوستوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرکے رہتا رہا تھا۔ گھر تو ان دونوں کا پہلا یہ تھا۔ چاہے کرایہ کا ہی سہی' وہ اپنے گھر کو بنانے' سجانے اور سنوارنے کے لیے ایک ایک کرکے گھر کی ضرورت کی ہر چیز خریدتی رہی۔ اپنی ساری تنخواہ خرچ کر ڈالتی تھی۔ حمیر اور وہ الگ الگ تو نہیں تھے۔ اگر اس کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو بھی جاتی تھی تو کیا ہوا؟ حمیر کی آمدنی جو اس کے مقابلے میں دگنی تھی' وہ اس میں سے ہر ماہ کافی رقم بچا لیا کرتا تھا۔ یہ بچت ان دونوں ہی کی تو تھی۔ ان دونوں کے اس گھر کے لیے یہ رقم جمع ہو رہی تھی جو ان کا اپنا ہوگا۔ اپنے ذاتی گھر کا خواب اس کا اور حمیر کا مشترکہ خواب تھا۔ اکثر وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اپنے گھر کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔

"ہم اپنے گھر کے لان کے ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگائیں گے۔ سرخ' سفید' گلابی' بہت سے رنگوں کے گلاب۔" وہاں کا لان کیسا ہوگا والی بات جیسے ہی شروع ہوتی' وہ فوراً" یہ کہا کرتی جب یہ باتیں ہو رہی ہوتیں' تب وہ چپکے سے دل میں یہ بھی سوچا کرتی کہ ان کے بچوں کا کمرہ کس طرح کا ہوگا؟ ان کے درمیان بچوں کے موضوع پر بہت زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ ہاں حمیر یہ ضرور کہتا تھا کہ وہ دو بچوں سے آگے اپنی فیملی نہیں بڑھائیں گے۔ وہ ابھی سے اس وقت کو سوچ کر دل میں انوکھی سی خوشی اور سرشاری محسوس کرتی۔ وہ وقت جب وہ ماں بنے گی' اس شخص کے بچے کی جسے وہ دل و جان سے چاہتی ہے۔ اپنا آپ کتنا معتبر اور کتنا مکمل لگنے لگے گا اسے اس وقت۔ وہ اس آنے والے وقت کا بہت صبر سے انتظار کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے حمیر کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ بس جواد بھائی کے ساتھ اس کا رویہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس موضوع پر کئی بار ان میں تکرار ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ جواد بھائی' حمیر سے واقعی بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اسے ہنی مون سے واپس آنے کے چند روز بعد ہی ہوگیا تھا۔ کتنے پیار سے وہ ان دونوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دینے آئے تھے اور حمیر نے انہیں روکھے انداز میں صاف انکار کردیا تھا۔ اس کے انکار پر ان کا چہرہ کیسا بجھ گیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس انکار میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا پھر بھی وہ شرمندہ ہوگئی تھی۔ وہ ان کے گھر مٹھائی اور پھل بھی لے کر آئے تھے۔ حمیر نے ان میں سے کسی چیز کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ چیزیں اس کے معیار کی نہیں تھیں۔ "ہمیں جواد بھائی کے گھر جانا چاہیے تھا حومی! وہ اتنے پیار سے ہمیں انوائٹ کرنے آئے تھے۔" ان کے جانے کے بعد وہ دل پر بوجھ سا محسوس کرتی حمیر سے بولی۔ حمیر اس کی بات سنی ان سنی کرکے اس کے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتا رہا۔

"کون سا ہم دونوں کے کوئی بہت ڈھیر سارے رشتہ دار ہیں۔ ایک جواد بھائی ہی تو ہیں' انسان خونی رشتوں سے کٹ کر تو زندگی نہیں گزار سکتا۔"

"فار گاڈ سیک ماہا! پلیز بور مت کرو یار! یہ فضول قسم

نصیحتیں کرکے تم میرے رومینٹک موڈ کا ستیاناس کررہی ہو۔" اس وقت وہ چپ ہوگئی تھی مگر وہ سمجھتی تھی کہ حمیر کے نظرانداز کرنے اور ہتک آمیز انداز اختیار کرنے کے باوجود جواد بھائی ان لوگوں سے ملنے آنا اور فون پر خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ وہ بھائی کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے تھے' انہیں اپنے قابل بھائی پر بڑا فخر تھا۔ حمیر کے رویوں کی تلافی کرنے کے لیے وہ خود ان سے بہت اچھی طرح ملتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ممی نہ کل کبھی اس کی زندگی میں شامل رہی تھیں ورنہ آج تھیں پھر بھی وہ ہفتہ میں ایک بار انہیں فون ضرور کرلیا کرتی تھی۔ کبھی کسی وجہ سے وہ فون نہ کرپاتی تو ممی اسے خود فون کرکے اس کی خیریت پوچھ لیا کرتی تھیں۔ تین' چار مہینوں بعد وہ کھڑے کھڑے ممی کے گھر بھی ہو آتی تھی۔

ان کی شادی کی دوسری سالگرہ سے چار ماہ پہلے حمیر کا پروموشن ہوا تھا۔ اپنی ترقی کی خوشی میں اس نے ماہا کو میپل پرل کے ایئررنگز گفٹ کیے تھے۔ اس موقع پر وہ خوش تو تھا مگر ایسا نہیں کہ اس نے کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دے ڈالا ہو۔ جو معیار اس نے خود اپنے لیے طے کر رکھا تھا' ابھی وہ اس سے بہت دور تھا۔

☆ ☆ ☆

رات تقریباً" پونے نو بجے دروازے پر بیل ہوئی تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے آکر دروازہ کھولا۔ حمیر نے گھر داخل ہوتے ہی اس کی تیاری کو بغور دیکھا۔

"آج کیا ہمیں کہیں جانا تھا؟ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا فون پر؟" وہ اس کی فون کال اور اب اتنی سنسنت تیاری دیکھ کر یہی اندازہ لگا پایا کہ شاید آج وہ کسی پارٹی میں انوائیٹڈ ہیں۔

"جانا تھا نہیں' جانا ہے۔ آج تم مجھے باہر ڈنر کرانے لے جارہے ہو' کسی بہت اچھی سی جگہ پر کیونکہ آج میں نے گھر پر کھانا نہیں پکایا ہے' اس لیے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے متبسم لہجے میں بولی۔ وہ نہ سمجھ میں آنے والی نگاہوں سے اسے دیکھتا' اس کے ساتھ اندر آگیا اور جیسے ہی ڈائننگ ٹیبل پر اس کی نگاہ پڑی' وہ ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ ٹیبل کے بیچوں بیچ رکھا خوبصورت سا کیک اور اس پر لگی دو موم بتیاں جو بیل کی آواز سنتے ہی اس نے جلا بھی دی تھیں۔

"ماہا!" وہ آگے کچھ بھی نہیں بول پایا۔ اس کے چہرے پر یک دم ہی شرمندگی پھیل گئی تھی۔ شاید اپنا پچھلے سال کا وہ وعدہ بھی یاد آگیا تھا جو سالگرہ بھول جانے پر اس نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ وہ آئندہ اس دن کو ہرگز نہیں بھولے گا۔

"ہیپی اینی ورسری حومی!" وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"ماہا! آئم سو سوری۔ میں پھر بھول گیا۔ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا؟" وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے' مجھے یاد دلانا چاہیے تھا۔" شرارتی سے لہجے میں مسکراہٹ دباتے وہ جیسے بڑی آسانی سے اپنی غلطی مان گئی تھی۔ "اب ہم کیک کاٹ لیں؟" وہ حمیر کا رخ کیک کی سمت کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔ "اس کے بعد میں تمہیں فریش ہونے کے لیے صرف دس منٹ کا ٹائم دینے والی ہوں کیونکہ مجھے بھوک بہت شدید لگ رہی ہے اور گھر میں کھانے کو آج واقعی کچھ نہیں ہے۔" وہ چھری ہاتھ میں پکڑ کر کھلکھلائی۔ ان دونوں نے مل کر موم بتیاں بجھائیں' کیک کاٹا اور پھر اسے ایک دوسرے کو کھلایا۔

"میں تمہارے ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی پچیسویں' چالیسویں بلکہ پچاسویں سالگرہ بھی منانا چاہتی ہوں۔ یونہی تم بھول جاؤ اور یونہی میں تمہیں یاد دلاؤں۔"

"پچاسویں سالگرہ' یعنی پچاس موم بتیاں۔ پچاس موم بتیاں کیک پر سمائیں گی کیسے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے' میں کیک بہت بڑا سا بیک

کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر پچاس موم بتیاں لگائی جاسکیں۔"

وہ اسے ڈنر کرانے لے آیا تھا اور ڈنر کرتے ہوئے وہ دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اس کا تحفہ اور کارڈ حمیر کو پسند تو بہت آئے تھے مگر وہ خود اس کے لیے کچھ نہیں لاسکا۔ اس بات پر وہ خاصا شرمندہ تھا۔

"تم نے میری ذرا بھی تعریف نہیں کی۔ تم سے اچھا تو آئینہ ہے جس نے کم از کم مجھے یہ تو بتادیا تھا کہ میں اچھی لگ رہی ہوں۔" اپنی ظاہری خوبصورتی سے بے نیاز رہنے والی لڑکی کو اب اپنی تعریفیں سننا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کے شکوے پر مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔

"حومی! کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟"

"بس ٹھیک لگ رہی ہو۔" حمیر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بس ٹھیک؟ پتا ہے' آج میں پارلر میں کتنے پیسے خرچ کر آئی ہوں؟ اور یہ ساڑھی جو میں نے خاص آج کے دن کے لیے خریدی تھی' کتنے کی ہے۔ میری نہیں تو کم از کم اس ساڑھی ہی کی تعریف کردو۔" ڈنر کے دوران وہ یونہی اسے اپنی تعریفیں کرنے کے لیے اکساتی رہی اور وہ "ٹھیک لگ رہی ہو" کہہ کہہ کر اسے چڑاتا رہا مگر وہاں سے واپس آنے کے بعد جیسے ہی وہ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی' حمیر اس کے شانوں کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے اس کے کان میں مدھم آواز میں بولا۔

"تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو ماہا! اور تمہارے خوبصورت لگنے میں اس ساڑھی کا کوئی کمال نہیں کیونکہ مجھے تو تم ہمیشہ ہی خوبصورت لگتی ہو۔ کبھی یہ سوچنے لگوں کہ اللہ نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہے اس میں میرے پاس سب سے قیمتی کیا ہے تو میرے ذہن میں صرف تم آتی ہو۔ تم میرے لیے بہت انمول اور بہت نایاب ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا!"

"کتنے دنوں بعد آج اتنے دل سے تم نے میری تعریف کی ہے۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔

"دنوں کو یاد رکھنے اور انہیں منانے کا یہی فائدہ ہوتا ہے حومی! ہم زندگی کی مصروفیات اور بھاگ دوڑ میں الجھ کر' اپنے کاموں میں لگ کر خود سے وابستہ ان لوگوں کو جن سے ہمیں بہت محبت ہوتی ہے' اکثر یہ نہیں بتا پاتے کہ ہمیں ان سے کتنی بے تحاشا محبت ہے۔ جیسے آج تم نے کتنے سارے دنوں بعد مجھے یہ بات پھر سے بتائی کہ میں تمہارے لیے کتنی اہم ہوں۔ میں چاہتی ہوں' سال بھر میں کم از کم ایک آج کے دن ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے ہوں۔ ایک دوسرے کو یہ یاد دلانے کے لیے ہمیں اب بھی ایک دوسرے سے پہلے جتنی ہی محبت ہے۔ گزرتا وقت ہماری محبت میں کمی نہیں بلکہ اس میں اضافہ کررہا ہے۔" حمیر نے جیسا کہا تھا' وہ واقعی اس کے ساتھ ویسی ہی زندگی گزار رہی تھی۔ انتہائی تیز رفتار' اتنی تیز' بھاگتی ہوئی کہ فرصت کے لمحات ان کے درمیان بہت کم آتے تھے۔

"کتنی جلدی دو سال گزر گئے' پتا ہی نہیں چلا ماہا!" کتنے دنوں بعد آج وہ دونوں اتنی فرصت سے اپنی باتیں کررہے تھے۔ آج حمیر کی آنکھوں میں نیند اور تھکن نہیں بلکہ صرف محبت تھی اور وہ اس کی یہ بات مان رہا تھا کہ دنوں کو یاد رکھنا چاہیے' انہیں سیلیبریٹ کرنا چاہیے۔"

"مجھے بہت اچھا لگے گا حومی! جب ایک روز تم مجھ سے کہو گے۔ "کتنی جلدی پچیس سال گزر گئے' پتا ہی نہیں چلا ماہا!" وہ جواباً قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بہت جلدی ہے پچیس سال گزارنے کی۔ پچیس سال بعد تم بوڑھی بھی تو ہوجاؤ گی۔ پہلی بار دیکھا ہے کہ کوئی لڑکی اتنی شدت سے بڑھاپے کی تمنا کرے۔" حمیر کے قہقہے میں اس کی ہنسی بھی شامل ہوگئی تھی۔

"اگلے سال میں آج کے دن کو ہرگز نہیں بھولوں گا۔ یکم فروری کو ہی اپنے آفس کے اور گھر کے کلینڈر پر سولہ فروری کی تاریخ کو ہائی لائٹ کردوں گا اور گفٹ تمہارے لیے جنوری کے آخر ہی میں خرید کر رکھوں گا۔" وہ جواب میں کچھ کہے بغیر شرارتی مسکان لبوں

...یکھتی رہی تو وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔
...سیں لگ رہا ہے میں پھر بھول جاؤں گا؟ دیکھ ...ب بھی نہیں بھولوں گا۔"
...ب کچھ کہہ رہی ہوں، مجھے پتا ہے تم یاد رکھو ... شوخی اور شرارت سے بھرپور مسکراہٹ ...وں پر روکتے ہوئے فوراً" بولی۔

...ت کو ساڑھے تین بجے تک جاگنے کا اثر یہ تھا کہ ... ذرا مشکل سے کھلی۔ روز وہ الارم بجنے سے ... کر بیٹھ جاتی تھی جبکہ آج الارم سے بھی اس کی آنکھ کھلی۔ حمیر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے ... بکھرے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتے ... اس نے اسے آواز دی۔ اس نے اپنی سوئی سوئی ... کھول کر اسے دیکھا تو وہ اسے اٹھنے کا کہہ کر ... میں کلپ لگاتی بستر سے اٹھ گئی۔ صبح وہ اپنی ... اور ناشتے کی تیاری ساتھ ساتھ کرتی تھی۔ ...ٹ کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر وہ تیزی سے کمرے میں ... ہنوز بے خبر گہری نیند سوتا نظر آیا۔

...مائی گاڈ۔" اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

...می! دیر ہوگئی، اٹھو۔" اس نے زور سے اس ...ندھے کو ہلایا۔

...کا لفظ سنتے ہی وہ فوراً" اٹھ بیٹھا اور جیسے ہی اس ... گھڑی پر گئی وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بستر سے ...نگ مار کر اترا اور بغیر کچھ کہے سنے سیدھا باتھ روم ...س گیا۔ کپڑوں کے ساتھ ہی ہینگر میں ٹائی بھی ... انہیں بیڈ پر رکھ کر باہر نکلی اور تیزی سے ناشتے ... ٹرے میں لگانے لگی۔ وہ ناشتہ لے کر کمرے ... آئی تو وہ ہڑبونگ مچائے شرٹ کے بٹن بند ... کے ساتھ ساتھ اپنے والٹ میں سے کچھ ...ھی کر رہا تھا۔

... دیر ہوگئی، میں ناشتہ بالکل نہیں کر سکتا۔ اتنی ...ٹ میٹنگ ہے۔ آج تو مجھے آٹھ سے بھی پہلے ...تھا۔" وہ اس کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر عجلت ... انداز میں بولا۔ وہ سینڈوچ اٹھا کر اس کے پاس ...

"میں ناشتہ نہیں کروں گا ماہا!" اس نے پلیٹ کر ہینگر میں سے ٹائی نکالی اور اسے گلے میں ڈالتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر منع کیا۔

"تم اپنی تیاری کرو۔"

"میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں، ناشتہ تم منہ سے کرو گے اور تیاری ہاتھوں سے۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوسکتے ہیں۔" اس کے پاس اس وقت بحث و مباحثہ اور انکار کا بھی ٹائم نہیں تھا، وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر اپنے ہاتھ سے اسے سینڈوچ کھلاتی رہی۔ بریف کیس میں فائلز سیٹ کر کے رکھتے وہ اس کے ہاتھ سے سینڈوچ کھانے کے ساتھ ساتھ اورنج جوس کا پورا گلاس بھی پی چکا تھا۔ اپنا کوٹ، موبائل اور بریف کیس اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ اس کا والٹ لے کر تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

"اوہ..... تھینکس ماہا! ارے آٹھ دس ہو رہے ہیں، تمہاری وین نکل گئی۔ چلو میں تمہیں ڈراپ کردوں۔" اس کی تیاری میں لگ کر وہ خود آج لیٹ ہوگئی تھی۔

"مجھے ڈراپ کرو گے تو تمہیں اور دیر نہیں ہوجائے گی؟ تم جاؤ، میری فکر مت کرو، میں چلی جاؤں گی۔ ہاں ڈرائیو احتیاط سے کرنا، کبھی دیر ہوگئی کے چکر میں ریش ڈرائیونگ کرنے لگو۔" وہ دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ آئی اور اسے محتاط ڈرائیونگ کی نصیحت کرنا بھی نہیں بھولی۔ دن بھر مختلف کاموں کے پیچھے خوار ہوتے رہنے کے بعد انسان رات گئے تک بھی کاموں ہی میں الجھا رہے اور خود کو آرام نہ دے تو صحت کا کیا حال ہوگا۔ کیسا بے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا وہ۔ دیر ہوجانے کے سبب وہ بغیر ناشتہ کیے اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک کرتی باہر نکلی تو حمیر ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا دل اسے اتنی گہری نیند سے جگانے پر ذرا خوش نہیں تھا۔ وہ اس کی صحت کا سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"کل لوگ پی سی میں ڈنر کرتے بڑے خوب

صورت لگ رہے تھے۔" فائز اس کے کیبن میں داخل ہونے کے بعد اس کی میز کے آگے سے کرسی گھسیٹ کر اس پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ یونہی شور مچاتا اور ہنگامے کرتا تھا۔ وہ کمپیوٹر پر اپنے کام میں مصروف تھی' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم میری جاسوسی کس خوشی میں کر رہے تھے؟" فائز عبید آئی بی اے میں اس کے ساتھ تھا۔ کمپیوٹر اسٹڈیز کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ ماہا کا کلاس فیلو تو ہرگز نہیں تھا مگر چونکہ وہ کلثوم کا فرسٹ کزن تھا اور اس کے ساتھ اس کی دوستی بھی بہت تھی' اسی لیے وہ وہاں اکثر ان لوگوں کے پاس آتا رہتا تھا۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا بذلہ سنج اور حاضر جواب تھا۔ اپنی ریزرو رہنے والی عادت کے برخلاف اس کی فائز سے آئی بی اے میں ان کی ملاقات کے چند ہفتوں ہی میں دوستی ہو گئی تھی بلکہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس نے دوستی کی تھی' وہ خود ہی اپنے بے تکلف انداز سے اس کا دوست بن بیٹھا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ جب ماہا نے یہ کمپنی جوائن کی' تب اس سے ایک ماہ قبل ہی وہ بھی اسی کمپنی کو جوائن کر چکا تھا۔

اپنے پاپا کے ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس اور ان کی کمپنی کو چھوڑ کر اس نے یہاں صرف اس ضد میں ملازمت اختیار کی تھی کہ وہ اپنے مما' پاپا اور تمام قریبی احباب کو جنہیں اس کی صلاحیتوں پر اگر کچھ شبہ تھا تو یہ دیکھ کر دور ہو جائے کہ وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں با آسانی ملازمت حاصل کر سکتا ہے۔

وہ یہاں سسٹم اینالائسٹ کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا مگر ڈپارٹمنٹ الگ ہونے کے باوجود وہ اکثر اس کے پاس آجایا کرتا تھا۔

"میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ ویسے تم نے اگر مجھے دیکھ لیا تھا تو آکر ملے کیوں نہیں؟ میں تمہیں حمیر سے ملواتی۔" مونیٹر سے نظریں ہٹا کر اس نے فائز کو دیکھا۔

"جس بندے سے میں دن کے چوبیس میں سے سترہ گھنٹے جلتا رہتا ہوں' اس سے مل کر کیا کرتا۔ ویسے سات گھنٹے میں نے سونے والے مائنس کیے ہیں۔" وہ میز کو اپنی انگلیوں سے بجاتا افسردگی سے بولا۔ "میں بے چارہ تو سوچتا ہی رہ گیا کہ ذرا ایم بی اے مکمل کر لوں اور کوئی معقول سی جاب حاصل کر لوں پھر اس لڑکی سے حال دل کہوں گا مگر وہ بندہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اسمارٹ نکلا۔ لے اڑا ہمارے انسٹی ٹیوٹ کی سب سے خوب صورت لڑکی کو۔" اپنی بے تکی باتوں کے دوران وہ ٹھنڈی آہیں بھرنا نہیں بھولا۔

"ذرا کسی دن میرے میاں کے سامنے کرنا یہ بکواس۔ وہ اچھی طرح تمہاری مزاج پرسی کرے گا۔"

"اچھا اچھا اب اپنے اس ہیرو کے ڈراوے مت دو مجھے۔ ویسے وہ بندہ تمہاری کچھ قدر شدر کرتا بھی ہے یا نہیں۔ کلثوم کہتی ہے' مشکل ہے کہ یہ لڑکی کسی جگہ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلا سکے۔ ذرا وقتاً" فوقتاً" جتاتی رہا کرو محترم کو کہ وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں' جنہیں اتنی اچھی بیوی ملی ہے۔" وہ پکی سہیلیوں والے انداز میں اسے گر کی باتیں سکھانے لگا۔

"وہ خوش قسمت ہے یا نہیں' یہ تو نہیں معلوم مگر میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے حمیر جیسا شوہر ملا ہے۔" دوبارہ مونیٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ بہت سنجیدہ اور پُریقین لہجے میں بولی۔

"اب تم اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ اپنا کام وام ہے بھی یا نہیں۔" وہ پرنٹر میں پیجز لگا رہی تھی۔

"جیلس ہو رہا ہوں اس بندے سے جس کے تم ہر وقت گن گاتی ہو اور دعا کر رہا ہوں کہ وہ تم جیسی اچھی لڑکی کی ہمیشہ قدر کرے اور جناب! کاموں کا یہ ہے کہ لنچ ٹائم ہو چکا ہے' میں یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کے کیبن کے پاس اسی لیے رکا تھا کہ لنچ ٹائم ہو جانے کی اطلاع دے سکوں۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چلو گی میرے ساتھ لنچ کرنے؟"

"نہیں' میں نے اپنے لیے یہیں پر سینڈوچز ا

...منوالیا ہے۔" اس نے قطعیت سے انکار کیا۔
"...ری ایسی قسمت کہاں کہ مسز ماہا حمیر رضا
...ے ساتھ لنچ یا ڈنر کریں۔ لڑکی تم نے مسز بننے میں
...جلدی کی ہے۔"
"...زی! تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں
...زارا کو فون کرتی ہوں۔" اس نے مصنوعی ناراضی
...سے گھورتے ہوئے زارا کا نام لے کر اسے دھمکایا
...کے انکل کی بیٹی ہونے کے علاوہ اس کی منگیتر
...تھی اور ایک بہت ہی سنجیدہ اور لمبے چوڑے لو
...کے بعد یہ منگنی انجام پائی تھی۔ زارا اور فائز کو
...بیسویں صدی کا رومیو جولیٹ یا لیلیٰ مجنوں بڑے
...سے کہا جا سکتا تھا۔
"جا رہا ہوں بھئی! ویسے کچھ اڑتی اڑتی سی خبر سنی
میں نے، کسی مسز ماہا حمیر کے پروموشن کے
...۔" وہ دروازے کی طرف جاتا ہوا سرسری سے
...میں بولا۔
"واقعی، تم سچ کہہ رہے ہو۔ کس سے سنا تم نے؟"
...سب کام چھوڑ چھاڑ خوشی و بے یقینی کی ملی جلی
کیفیت میں اس سے پوچھنے لگی۔ وہ اس کی بے قراری
...مسکرایا۔
"ابھی تو ہمیں نکالا جا رہا تھا۔ سچ ہے یارو! یہ دنیا ہے
مطلب کی۔"
"اچھا، صاف صاف بتاؤ ساری بات۔" وہ واپس
...کے پاس آ کر اسے اس کے مطلوبہ سوالوں کے
جواب دینے لگا۔
رات کو ڈنر کرتے ہوئے اس نے اپنے ممکنہ
...شن کی خبر حمیر کو بھی سنائی جس عہدے پر اسے
ملنے کا امکان تھا اس کے عہدے پر ترقی پانے
...ے ممکنہ دو امیدوار اور بھی تھے۔
"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ کیریئر والی جاب
...یہاں تم نے اپنی جگہ بنالی ہے، اب دیکھنا تم کتنا
...تک جاؤ گی۔" حمیر ڈنر کے دوران اس کی جاب
...کی ترقی کی متعلق باتیں کرتا رہا۔
...ن سمیٹتے اپنے اگلے دن پہننے والے کپڑے استری

کرنے اور دیگر ضروری گھریلو کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ حمیر کے لیے گلاس میں دودھ لے کر کمرے میں آگئی۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی صبح کی وہ گہری نیند ابھی بھولی نہیں تھی، اس لیے دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھ کر خفگی سے گویا ہوئی۔

"آج تم دیر تک جاگ کر کوئی کام نہیں کرو گے۔ دودھ پیو، دانت برش کرو اور اچھے بچوں کی طرح لیٹ کر سو جاؤ۔ یہ کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا، ہاں اس کے چکر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔" وہ بڑی تیز رفتاری سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے نہ اسے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ پاس رکھے دودھ کے گلاس کو۔

"حومی! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔"

"میں نے سن لیا ہے ماہا! میں دودھ پی لوں گا۔ تم پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ یہ رپورٹ بہت اہم ہے اور مجھے اسے آج ہر قیمت پر مکمل کرنا ہے۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے سامنے رکھے صفحات اور کی بورڈ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ "میرے مطلب کا کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ رپورٹ احسان کے حوالے کر دی تھی اور دیکھو ذرا کیا حشر کیا ہے محترم نے اس کا۔" اس نے اپنے سامنے رکھے صفحات کا پلندہ ہاتھ میں اٹھا کر بہت غصے سے اسے دکھایا۔

"اتنا کام تو میں بھی کر سکتی ہوں حومی! اور یقین کرو، میں بالکل تمہارے مطلب کا کام کروں گی۔ تمہارے لیے آج پوری نیند سونا بہت ضروری ہے۔ پچھلے کتنے سارے دنوں سے تم ڈھنگ سے پوری نیند سوئے تک نہیں ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو اپنے حال پر۔" اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کرسی پر سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"تم...... لیکن ماہا......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، یہ کام میں کر دیتی ہوں اور یقین رکھو تمہارے احسان صاحب جیسی کوئی گڑبڑ میں نہیں کروں گی۔" اس نے اسے زبردستی وہاں سے اٹھا دیا اور پھر ضد کر کے اسے بستر پر لیٹ جانے پر بھی مجبور

کردیا۔ وہ واقعی اتنا تھکا ہوا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی ادھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر وہ گردوپیش سے غافل گہری نیند سو گیا' اس کی نیند کو کمرے کی جلی ہوئی لائٹ تک ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ اگرچہ بڑی احتیاط سے کام کر رہی تھی۔ کسی قسم کا کوئی شور بھی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی مگر پرنٹس لیتے وقت پرنٹر کا مخصوص شور جب سناٹے میں گونجا تو اس نے فوراً" پلٹ کر حمیر کو دیکھا' وہ اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ یوں جب وہ تمام صفحات کے پرنٹ آؤٹس لینے اور کمپیوٹر بند کرنے کے بعد بستر پر آئی تو سوا چار بج رہے تھے۔ اس کی آنکھ لگنے والی تھی جب سوتے میں حمیر نے کروٹ بدلی اور اس کا ہاتھ ماہا کے کندھے سے ٹکرایا۔

"کام ہو گیا ماہا؟" اس نے غنودگی میں اس سے پوچھا۔ تھکاوٹ کے شدید احساس اور نیند کے غلبے کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ سوتے میں بھی اسے اپنے کاموں ہی کی ٹینشن تھی۔

"سو تو سکون سے جایا کیجئے مسٹر حمیر رضا! ہاں ہو گیا۔" اسے اطمینان دلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

صبح اس کی آنکھ اپنے مقررہ وقت پر کھل گئی تھی اور اٹھتے ہی اسے یوں لگا تھا جیسے ابھی تو آنکھ لگی تھی۔ آج حمیر صحیح وقت پر جاگ گیا تھا۔

"تھینک یو ماہا!" حمیر نے کھڑے کھڑے رپورٹ پر نگاہیں دوڑائیں اور پھر مطمئن ہو جانے والے انداز میں اسے اپنے بریف کیس میں رکھ دیا۔

"تم مجھے اپنی سیکریٹری اپائنٹ کرلو' میں تمہارا سارا کام بالکل ٹھیک ٹھیک کیا کروں گی' تمہاری مرضی کے مطابق۔"

"اتنی خوب صورت اور اتنی ذہین سیکریٹری' پھر تو میں گھر آیا ہی نہیں کروں گا۔ سارا وقت آفس میں رہا کروں گا۔" وہ ماہا کے شرارتی انداز کے جواب میں ہنستے ہوئے بولا۔

وہ آفس جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے نکل آئی تھی۔ لفٹ سے اتر کر اس کی نگاہ ریکا پر پڑی۔ ان کی بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہنے والی جاپانی میاں بیوی کی دو سالہ بیٹی۔ باوجود اس کے کہ اس وقت اس کی وین آنے کا ٹائم ہو رہا تھا پھر بھی وہ ریکا کو پیار کیے بغیر وہاں سے کیسے جا سکتی تھی؟ وہ اتنی چھوٹی سی اور اتنی پیاری سی تھی۔ واقعی جاپانی گڑیا اور جب اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر وہ تیز تیز چلتی تو اس کا دل چاہتا' وہ گود میں اٹھا کر اسے خوب ہی پیار کرے۔ اس کی جاپانی پڑوسن اپنے مخصوص تہذیبی انداز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سامنے کچھ جھکی اور پھر اس کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بھی جواباً" اس کی خیریت پوچھی اور اس دوران ریکا کو گود میں اٹھا کر جلدی سے اس کے دونوں گالوں پر پیار بھی کرلیا تھا۔

آفس میں ایک اور مصروف ترین دن اس کا منتظر تھا پھر آج تو آفس سے واپسی میں سیدھے اپنے اپارٹمنٹ جانے کی بجائے اسے کلثوم کے گھر جانا تھا۔ کلثوم کے جڑواں بچوں کی پہلی سالگرہ اور عقیقے کا فنکشن ایک ساتھ ہوا تھا' اور اس تقریب میں کلثوم نے اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر پر آکر بڑے خلوص سے اسے اور حمیر کو انوائٹ کیا تھا۔ وہ وہاں جانا چاہتی تھی مگر حمیر کے پاس اس روز بالکل فرصت نہیں تھی۔ اس نے کلثوم کے جانے کے بعد حمیر سے وہاں چلنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مصروفیت کا بتا کر وہاں جانے سے معذرت کرلی۔

رات کے وقت وہ اکیلی تو نہیں جا سکتی تھی۔ اسی لیے اسے اپنا جانا بھی ملتوی کرنا پڑا تھا۔ کلثوم سے اس نے فون پر معذرت کرلی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس نے اس کے نہ آنے پر بہت برا مانا ہو گا' اس لیے تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں کلثوم کے گھر اس کے بچوں کے لیے گفٹس لے کر ضرور جائے گی۔ حمیر کو وہ کل ہی اپنے آج کے پروگرام سے آگاہ کر چکی تھی۔ وہ اس پر پابندیاں نہیں لگاتا تھا مگر اس کے علم میں لائے بغیر کبھی کہیں نہیں جاتی تھی۔

آفس وین سے وہ راستے میں پڑنے والے شاپنگ

سینٹر پر اتر گئی۔ بچوں کے کھلونوں کی دکان کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اگر اسے کلثوم کے گھر پہنچنے کے جلدی نہ ہوتی تو وہ ابھی مزید کچھ وقت یہاں رکھے کھلونوں کو دیکھتے ہوئے بتا دیتی۔

وہ کلثوم کے گھر پہنچی تو وہ غیر متوقع طور پر اسے اپنے سامنے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اپنی ساری ناراضی بھلا کر والہانہ پن اور گرم جوشی سے اسے گلے سے لگا لیا۔ اسے شاید ماہا کے آنے کی امید نہ تھی۔ "اکیلی آئی ہو؟" جواباً" سر اثبات میں ہلا کر وہ اس کی گود سے اس کی بیٹی کو اپنی گود میں لے کر اسے پیار کرنے لگی۔

"جو ڈول میں تمہارے لیے لائی ہوں تم تو اس سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔" وہ اس کے گالوں پر چٹا چٹ پیار کرتے ہوئے محبت سے بولی۔

"شام کے وقت اکیلی کیوں آئیں ماہا؟ شہر کے حالات اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔" کلثوم کے چہرے پر اس کے لیے محبت بھری تشویش پھیلی ہوئی تھی۔

"مائی ڈیئر فرینڈ! میں اب یونیورسٹی گرل نہیں رہی۔ شادی شدہ عورت اور ورکنگ وومن ہوں۔ شام کا وقت مجھے کچھ نہیں کہتا۔" کلثوم نے جواباً" کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر اپنی ساس کو ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر قصداً" اس ذکر کو چھوڑ کر اس کی اور حمیر کی خیریت پوچھنے لگی۔ چائے کے لوازمات سے میسر ہونے کے بعد وہ فوراً" گھر واپسی کے لیے اٹھ جانا چاہتی تھی۔

"میں اتوار کے دن فرصت سے خوب لمبا بیٹھنے کے لیے آتی۔ مگر کیا کروں یار! چھٹی کا دن باقی سارے ہفتے سے بھی زیادہ مصروف گزرتا ہے۔"

"کتنا گھن چکر بنا کر رکھا ہوا ہے تم نے خود کو ماہا! ذرا حال تو دیکھو اپنا۔ کیسی کمزور لگ رہی ہو۔ اور آنکھوں کے نیچے اتنے گہرے حلقے جیسے نجانے کب سے پوری نیند بھی نہیں سوئیں۔"

"جو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، انہیں آپ ہمیشہ ہی کمزور لگتے ہیں۔ وہ کلثوم کے تشویش بھرے تدارپر مسکرا دی۔

"کبھی یہ حمیر رضا فرصت سے میرے ہاتھ لگے تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں۔ میری اتنی پیاری اور نازک سی دوست کا کیا حشر کر دیا ہے اس نے۔"

"ایکسکیوزمی، آپ میرے منہ پر میرے میاں کی برائی کر رہی ہیں۔" اس نے کلثوم کو گھورا، مگر وہ اس کے گھورنے سے ذرا متاثر نہیں ہوئی۔

"اس کے پاس تمہارے لیے کوئی ٹائم نہیں بڑی مصروف شخصیت ہیں موصوف۔ تم میرے گھر فنکشن پر آنا چاہتی تھیں مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ مگر وہ جو منسٹر لگے ہیں ان کے پاس بیوی کو اس کی اکلوتی سہیلی کے گھر لے جانے کا وقت نہیں تھا اور آج تم اتنی شام گئے یہاں اکیلی آئی ہو اور اکیلی ہی جاؤ گی۔ اسے تمہاری کچھ پروا ہے بھی کہ نہیں؟" وہ حمیر کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی تھی اسی لیے اس کے چہرے پر ناگواری سے بھرپور تاثر پھیل گیا۔

"پلیز کلثوم۔" اس نے سخت لہجے میں کلثوم کو ٹوکا۔

"مجھے تمہاری فکر ہے ماہا! اور یہ بندہ پتا نہیں کیوں مجھے ویسا نہیں لگتا جیسا تم اسے بتاتی ہو۔ بہت چالاک اور خود غرض لگتا ہے یہ مجھے۔ تمہیں فورس کر کے اس نے جاب کروائی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ جاب کرنا برا ہے۔ مگر شادی کے بعد یہ میری مرضی ہے کہ میں نوکری کروں یا نہیں۔ میرا تمام تر خرچ اٹھانا اور ساری ضروریات پوری کرنا میرے شوہر کی ذمہ داری ہے۔ کما کر لانا مرد کی ذمہ داری اور گھر خوش اسلوبی سے چلانا عورت کی ذمہ داری۔ جب ایک مرد ایک عورت کو اپنے نکاح میں لیتا ہے تو پھر وہ اس کے نان نفقے اور تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ میں نہیں کہہ رہی، یہ ہمارے مذہب نے ہمیں بتایا ہے۔ تم اس کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ برابر کا کما رہی ہو اور اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے وقت تک نہیں؟ پاکستان میں رہتے ہوئے تم دونوں امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہے ہو۔"

"بس کرو کلثوم! تم حمی کے خلاف یہ ساری بکواس اس لیے کر رہی ہو کہ میں تمہارے بچوں کے فنکشن

ر نہیں آسکی اور اس روز جب تم مجھے انوائیٹ کرنے آئی تھیں تب اس نے تم لوگوں کو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تم لوگوں کے آنے سے پہلے کہیں جانے کے لیے نکلنے والا تھا۔ وہ تم لوگوں کو اگنور نہیں کرنا چاہ رہا تھا' وہ واقعی ایک بہت اہم ڈنر میں جانے کے لیے لیٹ ہو رہا تھا۔" حمیر کے یہ کہنے کے بعد کہ وہ کہیں جا رہا تھا' کلثوم اور اس کا شوہر پھر ان کے گھر پر زیادہ دیر نہیں رکے تھے۔ اسے خود محسوس ہوا کہ کلثوم کو حمیر کا روکھا پھیکا انداز برا لگا تھا۔ تب حمیر کے رویے سے اسے بھی رنج ہوا تھا مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جس ڈنر میں جانے کے لیے وہ لیٹ ہو رہا تھا وہ اس کے پروفیشن کے حوالے سے اس کے لیے کس قدر اہم تھا۔

"تمہیں کیا معلوم وہ مجھ سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں کیا تم میں اور مجھ میں نہیں؟ وہ اپنے پروفیشن اور اپنے کیریئر کو بہت سنجیدگی سے لیتا ہے اور میں اسے برائی ہرگز نہیں سمجھتی۔ بس اسی وجہ سے' اس کے پاس کسی اور کے لیے تو کیا خود اپنے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ پھر وہ تمہارے میاں کی طرح نہیں کہ باپ کے ترکہ میں اسے ایک گھر اور دولت جائیداد مل گئی ہو۔ نہ اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں کچھ ملا ہے اور نہ مجھے۔ ہم دونوں کو مل کر اپنا ذاتی گھر بنانا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی خود بنانی اور خود سنوارنی ہے' ماں باپ کی طرف سے کسی سپورٹ کے بغیر۔ اگر اس مقصد کے حصول کے خاطر میں اس کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہی ہوں تو کس کے لیے؟ اپنے ہی لیے نا۔ اپنے ہی گھر کے لیے' اس میں کیا برائی ہے؟ اور اس کی محبت جس پر تمہیں شک ہے اس میں نہ کل میرے لیے کوئی کمی تھی اور نہ آج ہے۔ وہ پورا کا پورا میرا ہے۔"

اسے کلثوم کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے لہجے میں در آنے والے غصے پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کبھی کلثوم کا فون آنے پر وہ گھر پر نہ ہوتی اور پھر دوبارہ کبھی اسے فون پر بات ہونے پر اپنی غیر موجودگی کی وجوہات کے سلسلے میں یہ بول دیتی کہ وہ اپنے اپنے سردیوں یا گرمیوں کے کپڑے خریدنے گئی ہوئی تھی۔ گھر کا دوسرا کوئی بھی سامان خریدنے گئی ہوئی تھی تو اس کی ان تمام باتوں کو کلثوم اس انداز اور اس پیرائے میں لے گی' نہ صرف یہ کہ لے گی بلکہ انہیں یاد بھی رکھے گی اور اسے جتائے گی بھی۔ اگر اسے اس بات کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہوتا تو کبھی بھی اپنے منہ سے روانی اور سادگی میں نکلے ان جملوں کو نہ نکلنے دیتی۔

"محبت... ہونہہ۔" اس کے غصے کا اثر قبول کیے بغیر کلثوم تلخی سے بولی۔ "مجھے تو تمہاری یہ بات بھی سراسر جھوٹ لگتی ہے ماہا! کہ تم ابھی بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتیں۔ اگر بچے تمہیں ایسا ہی جھنجھٹ اور وبال لگتے تو میرے بچوں کو یوں تڑپ کر والہانہ انداز میں پیار نہ کیا کرتیں۔ جو عورتیں ماں بننے سے اتنی بیزار ہوتی ہیں پھر وہ دوسروں کے بچوں کو اس طرح پیار بھی نہیں کرتیں۔" کلثوم نے قدرے بے رحمانہ انداز میں یہ بات کہتے وقت ماہا اور اس کی گود میں عشناء کو بغور دیکھا۔ یوں جیسے اسے یہ جتانا چاہتی ہو کہ وہ جب سے یہاں آئی ہے' اس کی بیٹی مسلسل اس کی گود میں بیٹھی ہے اور وہ باتوں کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے گالوں اور ہاتھوں پر پیار بھی کرتی جا رہی ہے۔ بے ساختہ اور قطعاً" غیر اختیاری طور پر اس نے فوراً" عشناء کو گود سے اتار کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"میری نجی زندگی میں مداخلت کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے کلثوم! میں کب ماں بننا چاہوں گی' اس بات کا فیصلہ میں اور میرا شوہر مل کر کریں گے' تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی قطعاً" کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے اپنے یہاں آنے پر۔ نہ میں آج تمہارے گھر آتی اور نہ تم حومی کے خلاف میرے ہی منہ پر یہ فضول بکواس کرتیں۔" وہ یک دم ہی صوفے سے اٹھ گئی۔

"تم ناراض ہو جاؤ یا برا مانو' مگر میں کیا کروں ماہا! میں تمہاری دوست ہوں۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ میں نہ

سے بہت پیار کرتی ہوں اور میرا یہی پیار مجھے تمہاری فکر کرنے پر اکساتا ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ اس شخص پر یوں اندھا بھروسہ مت کرو۔ پتا نہیں کیا ہے مگر میری چھٹی حس کہتی ہے یہ ویسا نہیں جیسا دکھتا ہے۔ اس روز جب سے میں تمہارے گھر سے آئی ہوں تب سے تم سے یہ بات کہہ رہی ہوں ماہا! کہ اس شخص پر اتنا اعتبار مت کرو۔ اندھا بھروسہ تو کسی بھی بیوی کو اپنے شوہر پر نہیں کرنا چاہیے اور تم... تم تو خاص طور پر' وہ بندہ جو تمہارے ساتھ امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہا ہے تم اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار مت کرو۔ اپنی ساری کمائی بے دریغ خرچ مت کردیا کرو۔ ایسا تو وہ بیویاں بھی کرتی ہیں جو شوہر ہی کی کمائی پر گزارا کرتی ہیں۔ وہ بھی شوہر ہی کے دیے پیسوں میں سے شوہر کو خبر دیے بغیر کچھ نہ کچھ پیسے پس انداز کر کے ضرور رکھتی ہیں۔

مردوں کی قوم پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے ماہا! یہ محبت کا نام لے کر ہمیشہ عورت کو بے وقوف بناتے ہیں' اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔" کلثوم اس کے قریب آکر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے بولی۔

اس نے شدید غصے کے عالم میں کلثوم کے ہاتھ جھٹک دیے۔ کلثوم سے بہت ناراض اور بے انتہا خفا وہ اس وقت وہاں سے واپسی کے لیے اٹھ گئی مگر کلثوم نے اسے اکیلے واپس جانے نہیں دیا۔

وہ اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں اسے اس کے اپارٹمنٹ تک چھوڑ کر گئی تھی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے کلثوم کا۔ جو منہ میں آتا ہے بکے جاتی ہے۔ خود کے میاں نے گھر داری کرنے' بچے پالنے اور اپنی ماں کی خدمت کروانے کے لیے اسے گھر پر بٹھا کر رکھا ہے اس لیے اسے جاب کرنے والی ہر شادی شدہ لڑکی مظلوم اور اس کا شوہر ظالم نظر آتے ہیں۔ حومی اس روز صحیح تو تبصرہ کر رہا تھا اس کے میاں کے بارے میں۔ ایک سیدھا سادا MBBS کر کے اپنی گورنمنٹ جاب سے خوش اور مطمئن فیملی کی ٹھیک ٹھاک سپورٹ ہونے کے باوجود نہ اسپیشلائزیشن کیا نہ اپنا کچھ اچھا سا سیٹ اپ بنایا۔ وہی کنویں کے مینڈک۔ اعلا تعلیم یافتہ بیوی کو بھی گھر بٹھالیا کہ چلو تم میرے کمائے چند ہزار روپوں میں ہنسی خوشی گزارا کرو۔"

گھر آنے کے بعد تھوڑی دیر وہ کلثوم کی باتوں پر اپنا خون جلاتی رہی۔ پھر اس پر اور اس کی باتوں پر لعنت بھیج کر وہ منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کچن میں آگئی۔ آج دیر ہو گئی تھی اس لیے زیادہ اہتمام کرنے کا وقت نہیں بچا تھا۔ کام کے دوران ہی فون کی گھنٹی بجی۔

"ہو گئی اپنی سہیلی سے ملاقات؟" حمیر کی آواز سنتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ہاں۔ اب تو مجھے واپس آئے بھی کافی دیر ہو گئی۔ تم کب آرہے ہو؟" کارڈلیس کندھے کے سہارے کان کے پاس ٹکائے وہ ہنوز سیب کاٹنے میں مصروف تھی۔

"یہی بتانے کے لیے میں نے فون کیا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔ تم کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔"

"اور جو میں تمہارے لیے اتنی زبردست سوئٹ ڈش تیار کر رہی ہوں' اس کا کیا ہو گا؟"

"میں آکر کھالوں گا۔ پلیز یار سمجھا کرو۔ ارسلان صاحب نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔"

"ہاں مجھے پتا ہے اور تمہیں مجھے صفائیاں دینے اور وضاحتیں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرو مگر رات میں بہت زیادہ دیر بھی مت لگا دینا اور گھر واپسی میں احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرنا۔ جب دیر ہو جاتی ہے پھر تم بہت تیز ڈرائیونگ کرتے ہو۔" وہ حسب عادت اسے یہ نصیحت کرنا نہیں بھولی۔ ارسلان ایاز نے حمیر کو کوئی دفتری کام سونپا تھا یا ذاتی وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے اتنا بہرحال معلوم تھا کہ حمیر ان کے ذاتی نوعیت کے کام بھی اکثر کر دیا کرتا تھا۔ ان کی فیملی امریکہ سے آرہی ہے' وہ خود تو اسلام

...میں ہوں گے' اس لیے حمیران کی فیملی کو ریسیو ...ے ایئرپورٹ جائے گا' یا انہیں اپنے بیٹے کے لیے ...کمپیوٹر خریدنا ہے اور چونکہ انہیں اس بارے میں ...خاص معلومات نہیں' اس لیے حمیران کے بیٹے ...ے لیے کمپیوٹر خرید کر اسے ان کے گھر پہنچوا بھی ...ے گا۔ ان سے تعلقات اور دوستی اس کے لیے بہت ...م تھی۔

...لن کے کائیٹکس اور ان کا اثر ورسوخ زبردست ...۔ حمیر برملا اس سے کہتا تھا کہ یہ دور پبلک ...یشنگ کا دور ہے۔ آپ صرف اپنی ذہانتوں اور ...احیتوں کے سہارے وہ سب کچھ نہیں پاسکتے جو ...اسی پی آر بڑھا لینے سے حاصل کرسکتے ہیں۔

"اسلام آباد میں میرے کوئی چاچے' مامے نہیں ...یٹھے اور نہ میرا باپ میرے لیے کوئی مضبوط فیملی بیک ...راؤنڈ اور اثاثے چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو ...مضبوط کرنا ہے' اپنی مدد آپ کرنی ہے۔ ہمارا ملک تو ...ہے کہ نااہل سے نااہل آدمی اسلام آباد میں کسی ...چے' مامے کی مہربانیوں سے اونچی سے اونچی پوسٹ پر ...جمان ہوجاتا ہے۔ پھر ہم جو اہلیت بھی رکھتے ہیں ...بیت اور صلاحیت بھی صرف کسی مضبوط بیک ...راؤنڈ کے نہ ہونے کی پاداش میں پیچھے کیوں رہ ...یں؟" حمیر اکثر اس موضوع پر اس سے اسی طرح کی ...یں کیا کرتا تھا۔ یہ چیز خود اس کے اپنے مزاج کے ...ف تھی مگر اس نے کبھی حمیر سے اس بارے میں ...ث نہیں کی تھی۔

اس کے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا بیٹا ہاورڈ سے ...یجویشن کرکے آیا۔ ان کے اسٹاف کے تقریباً "تمام ...نے فرداً" فرداً" انہیں جاکر مبارک باد دی۔ یہاں ...کہ اس کے بعض کولیگز تو ان کے گھر پھول اور ...ئی تک لے کر پہنچ گئے اور اس سے اتنا بھی نہ ہوسکا ...ایک رسمی سی مبارک باد ہی انہیں ان کے آفس ...جاکر دے آتی۔ ایک بار تو انہوں نے اسے یہ کہہ ...وک دیا تھا کہ عید پر اس کے سوا ان کے پاس تمام ...ف ممبرز کے عید مبارک کہنے کے لیے فون آئے تھے اور وہ پھر بھی خود کو بدل نہ سکی۔

✲ ✲ ✲

"تم تھوڑا سا پہلے مجھے بتا دیتے تو مجھے بہت آسانی ہوجاتی حومی!"

"دراصل میرا ارادہ تو پیٹر اور ان کی مسز کو کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کے لیے انوائٹ کرنے کا تھا۔ آج جب میں نے انہیں دعوت دی تو انہوں نے بہت خوشی سے قبول کرلی' مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کردی کہ اگر میں انہیں ڈنر کروانا چاہتا ہوں تو اپنے گھر پر کرواؤں۔ وہ گھر کے بنے ہوئے پاکستانی کھانے کھانا چاہتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ' میں انہیں انکار کیسے کرتا؟" امریکہ سے حمیر کے بینک کے ایک سینئر عہدیدار اپنی بیگم کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے اور ان ہی کو حمیر نے کل رات اپنے گھر کھانے پر انوائٹ کرلیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ اس وجہ سے فکرمند اور پریشان ہوگئی تھی کہ اسے اس دعوت کی اطلاع رات دس بجے کھانا کھاتے ہوئے حمیر نے دی تھی۔ یہ حمیر کے ایک سینئر آفیسر کی دعوت تھی اور اس میں ہر چیز بہت بہترین چاہیے تھی۔ کل اسے آفس جانا تھا اور اب رات کے دس بجے وہ دعوت کے لیے درکار سامان کہاں خریدنے پہنچتی۔ اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ وہ کیا کرے اور کس طرح کرے۔

"کیا سوچ رہی ہو ماہا؟ کیا تم مینیج نہیں کرپاؤ گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر میں کسی ہوٹل سے کھانا گھر پر منگوا لوں گا۔ اب انہیں گھر پر انوائٹ کرچکا ہوں تو کھانا تو انہیں گھر پر ہی......"

"تم فکر مت کرو' میں سب کچھ کرلوں گی۔ کسی ہوٹل سے کھانا منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آر یو شیور؟" حمیر کے استفسار پر اس نے سر اثبات میں ہلادیا۔

حمیر کے سوجانے کے بعد اس نے اپنے قریب ٹائم پیس رکھ کر اس میں چار بجے کا الارم لگایا اور خود بھی

لیٹ گئی۔ اس کے اعصاب پر دعوت ایسی سوار تھی کہ الارم بجنے سے پہلے ہی پونے چار بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ حمیر بے خبر سو رہا تھا' فریزر میں مرغی' مچھلی اور گائے کا گوشت سب موجود تھا اور پھر دعوت بھی فقط دو ہی افراد کی تھی' اس نے چاروں چولہوں پر ایک ایک کر کے مختلف چیزیں چڑھا دی تھیں۔ سب سے زیادہ احتیاط اسے یہ کرنی پڑ رہی تھی کہ کوئی شور شرابا نہ ہو۔ ہلکے سے کھٹکے سے حمیر کی آنکھ ضرور کھل سکتی تھی۔

آفس جانے کے وقت تک جتنا کچھ وہ کر سکتی تھی' اس نے کر لیا تھا۔ "پیٹر کو ان کے ہوٹل سے لے کر تو میں ہی آؤں گا۔ میں انہیں نو' ساڑھے نو بجے سے پہلے گھر نہیں لاؤں گا۔ اتنے میں تیاری کا زیادہ موقع مل جائے گا۔" وہ اس کے اطمینان دلانے پر مسکراتے ہوئے اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔

اسے کیا کیا کرنا تھا' یہ سب وہ اب پوری طرح طے کر چکی تھی' اسی لیے جیسے ہی اس کا لنچ ٹائم ہوا' وہ اپنے آفس سے فوراً" نکل آئی۔

لنچ ٹائم ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی تھے' جب وہ خوب لدی پھندی اپنے آفس میں داخل ہو رہی تھی۔ فائز کہیں باہر سے لنچ کر کے آ رہا تھا۔ اس نے اسے اتنے ڈھیر سارے تھیلوں کے ساتھ دیکھا تو اس کے قریب آ کر پُر تجسّس انداز میں بولا۔

"خیریت تو ہے؟ کیا آج تم ہم سب کولیگز کو کوئی سرپرائز پارٹی دینے والی ہو؟"

"بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔" فائز نے جواباً" اسے گھورتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے تھیلے پکڑنے چاہے تو وہ جلدی سے بولی۔

"اٹس اوکے فائز! میں اٹھا لوں گی۔"

"دوستوں کو ایک سیکنڈ میں پرایا بنانے میں تمہیں بہت مزا آتا ہے ماہا حمیر رضا!" اس کے انکار کے باوجود اس نے اس کے ہاتھوں سے شاپنگ بیگز لے لیے۔

"حمیر نے اپنے ایک جاننے والے کو آج دعوت پر بلایا ہے' اسی لیے یہ تھوڑی سی چیزیں خریدنے گئی تھی۔" وہ لفٹ سے نکل کر اس کے ساتھ اس کے کیبن تک آ گیا تھا۔

"تم اکیلے کہاں سے لنچ کر کے آ رہے ہو؟"

"اکیلا کہاں' وہ محترمہ زارا صاحبہ ہیں نا۔ حالانکہ آج میں اتنا بزی تھا پھر بھی محترمہ نے حکم جاری فرما دیا کہ میرا پیزا ہٹ میں لنچ کرنے کا موڈ ہے۔ تم لنچ ٹائم میں وہاں پہنچو' میں بھی اپنے کالج سے سیدھی وہیں آ جاؤں گی۔ ارے یار! میں کہتا ہوں بندے کو محبت نہیں کرنی چاہیے' نری خواری ہے۔"

وہ سارے شاپنگ بیگز اس کی میز کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ فائز کے برا مان جانے کے خوف سے اس نے اسے تھینکس نہیں کہا تھا۔

آفس وین دیر سے گھر پہنچاتی' اسی لیے وہ شام میں خود ہی رکشہ سے گھر واپس آ گئی اور آتے ہی اس نے اس پھرتی اور تیز رفتاری سے کام شروع کیا جیسے واقعی کوئی مشین ہو کہ کھانے میں سب کچھ بہترین ہونا چاہیے تھا۔ نو پینتیس پر جب ان کے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجی تو نہ صرف یہ کہ کھانا پوری طرح تیار تھا بلکہ وہ خود بھی بہترین تراش خراش والا اسٹائلش سا سوٹ پہنے اور ہلکا سا میک اپ کیے تیار تھی۔

خیر مقدمی مسکراہٹ لیے ہوئے دوستانہ انداز کے ساتھ اس نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی اگر حمیر رضا کی بیوی کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے متاثر ہوئے تھے تو اس کا پکایا پاکستانی کھانا بھی انہیں بہت پسند آیا تھا۔ پیٹر کی بیگم کو اس کی بنائی ہوئی کھیر اس قدر پسند آئی تھی کہ بصد اصرار انہوں نے اس سے اس کی ترکیب مانگی۔

"میں امریکہ میں یہ اپنی دوستوں کو بنا کر ضرور کھلاؤں گی۔" چلتے وقت انہوں نے اس کے پکائے کھانوں کی تعریف کرنے کے بعد یہ بات کہی۔

حمیر انہیں واپس ان کے ہوٹل چھوڑنے چلا گیا۔ وہ جلدی سے لباس تبدیل کر کے برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ بچے ہوئے سارے کھانے فریزر میں پہنچانے کے بعد وہ برتن دھونے لگی۔ مین ڈور کا لاک

...ے اسے آواز آئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ یہ حمیر ہے' ...یے وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اندر آنے کے ...ے سیدھا کچن ہی میں آیا تھا۔

"تھینکس ماہا!" وہ اس کے بالکل پیچھے آکر کھڑا ...ا اور اس کی گردن میں بازو حمائل کردیے۔

"تم بہت تھک گئی ہوگی نا؟"

"اگر کھانا اور باقی سب کچھ تمہارے معیار کے ...ق تھا تو بالکل نہیں تھکی اور اگر کوئی ایک بھی چیز ...رے معیار سے کم تھی تو واقعی بہت تھک گئی ...ں۔"

"سب کچھ بہت اچھا تھا ماہا! ایک دم پرفیکٹ۔ پیٹر ...ر بلانے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ ہوٹل ...ں ہمارے درمیان یہ بے تکلفانہ فضا کبھی پیدا نہ ...تی جیسی گھر پر ہوئی ہے۔ میں ان کے ساتھ جس ...رح کے قریبی تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا' وہ تمہاری ...جہ سے ہوگئے ہیں ماہا! میری ایونز تو تمہاری اور تمہاری ...ب کی پکی عاشق ہو کر گئی ہیں۔ ابھی راستے میں مجھ ...ے تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔ پیٹر ایونز اور ...ن کی بیوی کے ساتھ اس بے تکلفی کا سارا کریڈٹ ...یں جاتا ہے ماہا!" وہ اس کے پیچھے سے ہٹ کر اس ...ے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے صابن لگا کر ...گے برتنوں کو دوسرے سنک میں کھنگالنے لگا۔

"ارے تم یہ کیا کرنے لگے؟"

"تمہاری ہیلپ کروا رہا ہوں۔" اس نے پلیٹ پانی ...ے دھو کر سائیڈ میں رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"مجھے کوئی ہیلپ نہیں چاہیے' تھوڑے سے تو ...ن ہیں۔ تم جاؤ' میں بھی بس دس پندرہ منٹ میں ...رے میں آرہی ہوں۔" اس نے فوراً اسے وہاں ...ے ہٹا دیا۔

"اچھا پھر جلدی سے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ...ں۔" اس کے کہنے سے وہ وہاں سے ہٹ گیا اور پھر ...ن سے نکلتے ہوئے اسے کمرے میں جلدی آنے کا ...

☼ ☼ ☼

حمیر نے نئی گاڑی خریدی تھی۔ اپنی نئی گاڑی میں سب سے پہلے اس نے ماہا ہی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اپنی نئی گاڑی پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی وہ گاڑی نہیں جو وہ ڈرائیو کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مرسڈیز' BMW اور نجانے کن کن مہنگی گاڑیوں کی باتیں کرنا شروع کیں تو وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اسے ٹوک گئی۔

"حومی! مجھے پتا ہے آسمانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار ہیں مگر پلیز کچھ دیر تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح خوش ہولو۔"

وہ جواباً" سر اثبات میں ہلا کر ہنسا۔ "جو حکم جناب کا۔" ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد حمیر نے ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی پارک کردی۔ اندر آکر ایک میز منتخب کرنے کے بعد وہ اس پر بیٹھی تو اس کی نگاہ اپنی میز کے قریب کی ایک میز پر بیٹھی پانچ لڑکیوں کے گروپ پر پڑی۔ وہ پانچوں کی پانچوں اسے اور حمیر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" اسے کن انکھیوں سے ایک میز کی طرف دیکھتے اور مسکراہٹ دباتے دیکھ کر حمیر نے تعجب سے پوچھا۔

"میں ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے' تم بہت ہینڈسم لگ رہے ہو اور مجھے بہت ملامتی نگاہوں سے وہ سب اس طرح دیکھ رہی ہیں جیسے میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر تم سے ملنے آئی ہوں۔"

حمیر محظوظ ہو جانے والے انداز میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "سچ کہہ رہی ہوں حومی! ان کی نظریں دیکھ کر ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے پتا نہیں مسئلہ کیا ہے' میں لوگوں کو شادی شدہ کیوں نہیں لگتی؟"

"یہ افسوس کی بات ہے یا خوشی کی کہ تم ابھی بھی کالج گرل نظر آتی ہو؟" وہ اس پر ستائشی نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

"وہ بات تو صحیح ہے مگر ہر وقت یہ چیز فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ اب دیکھو' ہمارے جونئے فائنانس ڈائریکٹر آئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے بڑے شریف

آدمی ہیں مگر کیا کریں کہ انہوں نے آتے ہی از خود یہ فرض کر لیا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ دن میں پانچ دفعہ مجھے اپنے آفس میں بلواتے اور ان میں سے تین دفعہ بالکل غیر ضروری' کسی ایسے فضول سے کام کے لیے جس پر سوچنا ان کی پوسٹ کے شایان شان بھی نہیں تھا۔ مجبوراً" مجھے ان کے سامنے تمہارا ذکر کرنا پڑا۔ یہ بتانا پڑا کہ جی میں خیر سے شادی شدہ ہوں۔ مسز واصف کہہ رہی تھیں کہ اس میں ان بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔ میں کیل کانٹے سے لیس غیر شادی شدہ نظر آتی ہوں۔"

وہ آئس کریم کا چمچ منہ میں لے جاتے ہوئے بولی۔ وہ جیولری میں فقط تین چیزیں پہنتی تھی جو حمیر نے اسے تحفے میں دی تھیں اور جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے پہنائی تھیں۔

"میں سوچ رہی ہوں' گولڈ کی دو چوڑیاں خرید کر ہاتھوں میں ڈال لوں۔ شاید اس سے لوگوں کو میں شادی شدہ لگنے لگوں۔"

"پہلی فرصت میں یہ کام کرو بلکہ میں تو کہتا ہوں تھوڑا سا وزن بھی بڑھا لو اور یہ فائنانس ڈائریکٹر کا کیا قصہ ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اس خبیث کے بارے میں؟" وہ مصنوعی قسم کا غصہ طاری کر کے اس سے بولا پھر اسے ہنستا دیکھ کر خود بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

وہاں سے باہر نکل کر وہ اپنی گاڑی کی طرف آ ہی رہے تھے جب فٹ پاتھ پر اپنی دھن میں مگن چلتے ایک شخص کی نگاہ حمیر پر پڑی۔ وہ چلتا چلتا ٹھٹک کر رک گیا۔ چند سیکنڈ اس نے جیسے اسے پہچاننے میں لگائے اور پھر وہیں سے چلایا۔

"حمیر!" وہ شخص تیز رفتاری سے بھاگتا سیدھا ان دونوں کے پاس آ کر رکا۔ تیز بھاگنے سے اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا اور اس کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری ہوئی تھی۔ وہ بہت پرجوش طریقے سے حمیر سے بغل گیر ہو گیا تھا۔

"کیسا ہے یار تو' پہچانا نہیں مجھے' میں غلام عباس ہوں۔"

کسی بہت پرانے اور بہت پیارے دوست کے مل جانے کی سچی خوشی اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی مگر حمیر کے چہرے پر کوئی خوشی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنے گلے سے لگے اس شخص کو اس نے فوراً" ہی خود سے دور ہٹایا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" حمیر کا جواب مختصر اور کسی بھی طرح کے جوش و خروش سے عاری تھا۔ اس شخص نے شاید ابھی اس سرد مہری کو محسوس کیا نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں ماہا پر پڑیں تو سوالیہ انداز میں حمیر کی طرف دیکھا۔

"میری بیوی ہے۔" حمیر نے خشک لہجے میں تعارف کروایا۔ اس کی نگاہوں اور لہجے میں سرد مہری اور اجنبیت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس کے پل پل کے ساتھی تھی' اس کی مزاج آشنا' اس لیے ان نگاہوں کو ایک لمحہ میں محسوس کر چکی تھی۔

"السلام علیکم بھابھی جی!"

"وعلیکم السلام۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بہت ہلکا سا مسکرائی۔

"بڑی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔ یہ حمیر میرے بچپن کا دوست ہے۔ کبھی اس نے ذکر کیا میرے آپ سے؟ ہم نے پہلی کلاس میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ پہلی سے آٹھویں تک ہم نے ایک ساتھ پڑھا۔ ہمارے اسکول میں بینچیں وینچیں بالکل نہیں تھیں۔ ہم زمین پر بیٹھتے تھے' میں اور حمیر ہمیشہ برابر بیٹھتے تھے۔ یاد ہے تمہیں حمیر؟" وہ پہلے اس سے اور پھر حمیر سے مخاطب ہوا۔ حمیر اسے جواب دینے کے بجائے جیب سے گاڑی کی چابی نکالنے لگا۔

"بڑا پڑھاکو تھا یہ۔ اپنے گھر پر پڑھنے کی جگہ نہیں ملتی تو میرے ساتھ میرے ابا کی دکان پر آ جاتا۔ ابا جی ہمارے حوالے کر کے شام میں گھر چلے جاتے۔ یہ دکان پر آنے والے خریداروں کو نمٹاتا اور یہ دکان کے بالکل اندر کونے والی جگہ پر بیٹھ کر پڑھائیاں کرتا رہتا۔ ہم رات دیر تک وہیں رہتے۔ ساتھ کھانا کھاتے

...بھار تو ساری رات وہیں گزار دیتے۔ کیا وقت تھا ...ے" اسے لگا کہ حمیر اس شخص سے فوراً" پیچھا ...ر کسی بھی طرح وہاں سے گاڑی تک پہنچنا چاہتا ...ے

...ن کے قدم اٹھنے کے لیے بالکل تیار تھے اور زبان ...ید کوئی بداخلاقی اور بے مروتی سے بھرپور جملہ ...ے ہی والا تھا۔ وہ حمیر کے کچھ کہنے سے پہلے بے ...ختہ بولی۔

"آپ کیا کرتے ہیں غلام عباس بھائی؟" حمیر کی ...ے بھری نگاہیں وہ نظر انداز کر گئی۔ وہ سادہ و مخلص سا ...ں اسے اس سلوک کا حقدار قطعاً" نہیں لگ رہا ...جو حمیر اس کے ساتھ کر رہا تھا اور جسے وہ اپنی خوشی ...خوشی اور اپنی سادگی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"ہم نے کیا کرنا ہے بھابھی جی! گھر کے حالات ایسے ...تھے کہ آٹھویں سے آگے پڑھ ہی نہ سکا۔ بس ابا کی ...ن سنبھال لی۔ ابا کی کرائے کی دکان تھی۔ میں نے ...ے خرید لیا۔ بس جی بڑا کرم ہے مولا کا، بڑا اچھا گزارا ...ہے اور حمیر! تو کیا کر رہا ہے یار آج کل؟ پرانے ...سے کیا گیا، اپنے پرانے دوست کو بھی بھول گیا۔"

"ماہا! میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" ...غلام عباس کو جواب دیے بغیر ماہا سے کرخت لہجے ...آنے کا کہہ کر گاڑی کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنے ...خروش اور خوشی سے نکل کر حیرت اور بے یقینی ...ے گاڑی میں بیٹھ جانے والے اپنے پرانے دوست کو ...رہا تھا۔ وہ اس کم تعلیم یافتہ و سادہ سے انسان کی ...ں میں پھیلتے دکھ کو دیکھ نہیں سکتی تھی، اس لیے ...طرف نگاہیں ڈالے بغیر آہستگی سے بولی۔

"...صل میں حمیر ابھی جلدی میں ہیں، ہمیں کہیں ...ت ضروری پہنچنا ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ...ہے غلام عباس بھائی! اللہ حافظ۔" اسے اس ...ے ایسی ندامت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی ...ی دیکھے بغیر یہ جملے کہہ کر تیزی سے اپنی گاڑی کے ...نی۔

...ر ایسا بوجھ پڑا تھا جیسے حمیر نے نہیں، خود اسی نے اس شخص کی تحقیر کی ہے۔ حمیر لب بھینچے غصے سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور غصے کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔

"حومی!" اس نے حمیر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ حمیر نے اس کے ہاتھ کو بہت غصے سے جھٹک دیا۔ "وہ بے چارہ اتنے خلوص سے بات کر رہا تھا حومی! وہ ہم سے کیا مانگ رہا تھا؟"

"جس سے میں بات کرنا پسند نہیں کر رہا تھا، اس پر خلوص نچھاور کرنے کا تمہیں کیوں شوق ہو رہا تھا؟ ایسے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے میری بیوی اخلاق بگھارے، ہونہہ۔ تمہیں کیا نظر نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔" وہ بہت ناراضی سے تیز آواز میں بولا۔

"اچھا آئم سوری۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم پلیز اپنا موڈ تو مت خراب کرو۔" اس کا انداز مکمل طور پر معذرت خواہانہ اور صلح جوئی والا تھا۔ وہ اپنے جس فعل پر ذرہ برابر بھی شرمندہ نہیں تھی، اس پر سارا راستہ اسی سے معافی مانگتی رہی۔ اسے منا لینے والی مسلسل کوششوں اور تسلسل سے معافی مانگتے رہنے سے یہ ہوا تھا کہ اپنے بیڈروم میں آکر بستر پر لیٹنے کے بعد وہ اس سے منہ پھیر کر کروٹ بدل کر نہیں لیٹا تھا۔ جب اس کے برابر لیٹنے سے پہلے اس نے اس کا ہاتھ سیدھا کیا اور پھر پورے استحقاق کے ساتھ اس پر سر رکھ کر لیٹ گئی تو اس نے نہ اپنا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی اور نہ اسے دور ہٹایا۔

"مجھ سے ناراض ہو کر سوؤ گے تو تمہیں نیند آجائے گی؟" اس کی ناراضی میں قدرے کمی ہوتی دیکھ کر اس کے اوسان بحال ہوئے تھے۔ حمیر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی دیکھ کر سکھ کا سانس لیتے اس نے خود سے ہزار دفعہ کا کیا وعدہ ایک مرتبہ پھر کیا۔

☼ ☼ ☼

اپنی ترقی کی خبر پر وہ بہت خوش تھی اور اس رات وہ حمیر کے ساتھ خوشی خوشی اپنی ترقی ہی کو ڈسکس کیے

جارہی تھی۔ اب اس کی تنخواہ میں کتنا اضافہ ہوجائے گا۔ دیگر کیا کیا مراعات اسے مزید ملنے لگیں گی مگر وہ اس کی باتوں میں اس طرح دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی کہ عموماً لیا کرتا تھا۔ وہ ایک دو دن سے ہی ماہا کو کچھ چپ چپ سا اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے حومی! تم مجھے پرسوں شام سے ہی خاموش اور الجھے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں ہوا۔ خوامخواہ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔"

"وہم؟ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ' ابھی میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

"تم اپنے پروموشن کی بات کر رہی تھیں۔"

"جی نہیں' وہ بات تو میں ختم بھی کر چکی تھی۔ میں تو اب یہ بات کر رہی تھی کہ آج ہمیں کوئی اچھی سی مووی دیکھنی چاہیے۔ کل چھٹی بھی ہے اور پھر ہمیں ایک ساتھ فلم دیکھے بہت دن بھی ہوگئے ہیں۔"

"آج نہیں ماہا! آج مجھے بہت نیند آرہی ہے۔"

اسے حمیر کے لہجے میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔

"حومی! کیا ہوا ہے؟ تم مجھے تو بتاؤ۔ اگر کسی وجہ سے پریشان ہو تو پلیز مجھ سے شیئر کرو۔" وہ اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنے طرف کرتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔

"میں کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں ہوا' بلاوجہ لٹھ لے کر ایک ہی بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔" جھڑک دینے والے انداز میں اس سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بھی اپنے چہرے پر سے ہٹا دیا' پھر تکیہ پر سر رکھ کر لیٹتے ہوئے تنبیہی لہجے میں اس سے بولا۔

"اب میں سونا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" اس نے کروٹ بدل لی۔

صبح وہ اپنے نارمل موڈ میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اپنے رات کے رویے پر نہ اس نے ماہا سے سوری کہا اور نہ اس نے اسے کچھ جتایا۔

دیر سے سو کر اٹھنے اور چھٹی والے دن کا خوب شاندار اہتمام والا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے چھٹی والے دن کے مخصوص کاموں میں مصروف ہوگئی۔

ایک طرف واشنگ مشین لگی ہوئی تھی' دوسری طرف کچن میں سارے چولہوں پر کچھ نہ کچھ چڑھا ہوا تھا اور تیسرا کام ہاتھ کے ہاتھ اس نے حمیر کے جوتوں کی پالش کرنے کا شروع کیا ہوا تھا۔ چھٹی والے دن فرصت سے یہ کام کر لو تو روز بس ایک ہلکا سا برش پھیرنا ہی کافی ہو جایا کرتا تھا۔

وہ باتھ روم میں کھڑا شیو بنا رہا تھا اور باتھ روم کا دروازہ چونکہ کھلا تھا' اس لیے اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ گاہے گاہے اس پر نگاہ ڈال کر اسے یہ کہہ کر چھیڑ بھی رہا تھا کہ وہ اگر چاہتی تو بہت اچھی جوتے پالش کرنے والی بھی بن سکتی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے حمیر کے موبائل کی بپ بجی تھی۔

"ماہا! دیکھنا کون ہے۔ اگر کوئی خاص فون ہو تو میری بات کروا دینا' ورنہ میسج لے لینا۔"

وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھی اور بیڈ کے پاس آکر موبائل اٹھایا۔

"ہیلو!"

"مجھے حمیر رضا سے بات کرنی ہے۔" اپنے ہیلو کے جواب میں اس نے ایک خوبصورت زنانہ آواز سنی۔

"آپ کون بول رہی ہیں؟"

"سدرہ آفاق۔" وہ اس نام کی کسی خاتون کو جانتی نہیں تھی' اس لیے ایک پل کو فون کے خاص یا عام ہونے کے بارے میں سوچا پھر کچھ سوچ کر حمیر کے پاس آگئی۔

"کس کا ہے؟" حمیر نے بے آواز پوچھا۔

"کوئی سدرہ آفاق ہیں۔" اس نے بھی آہستہ ہی سے جواب دیا۔ حمیر نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا تو وہ باتھ روم سے باہر آگئی اور دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہوگئی۔ حمیر کی گفتگو کی نہ اسے آواز آرہی تھی اور نہ اس نے قصداً سننے کی کوئی کوشش کی تھی۔

"یہ سدرہ آفاق کون ہے؟ پہلے کبھی نام نہیں سنا اس کا؟" حمیر دوپہر میں اسی وقت شیو کرنے اور نہانے کے فوراً بعد اس سے کسی ضروری کام کا کہہ کر گھر سے چلا گیا تھا اور پھر اب رات کے کھانے سے کچھ

پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔
کھانا کھانے کے دوران وہ یونہی عام سے لہجے میں حمیر سے اس فون والی لڑکی کے متعلق پوچھ بیٹھی' بغیر کسی خاص تجسّس کے۔
"کولیگ ہے میری' مہینہ بھر پہلے جوائن کیا ہے۔ ہاورڈ سے ماسٹرز کر کے آئی ہے۔ ہو گئی تسلی؟" وہ چاولوں کی ڈش زور سے پٹخ کر غصے سے بولا۔
"حومی!" اس نے حیرت سے اس کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھا۔
"کیا یہ ضروری ہے کہ میں اپنے ہر جاننے والے کی تفصیلات تمہاری خدمت میں پیش کیا کروں؟" اسے پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آگیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ بھی غصے سے دور ہٹا دی تھی۔
"حومی! کیا ہو گیا ہے' میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔ تم خفا کیوں ہو رہے ہو؟"
"دماغ خراب ہو گیا ہے میرا' پاگل ہو گیا ہوں۔" وہ کھانا چھوڑ کر میز پر سے اٹھا اور پھر کرسی کو ٹھوکر مارتے ہوئے دروازہ کھول کر بالکونی میں چلا گیا۔
"تمہیں میری کیا بات بری لگی ہے حومی! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ تم اتنی سی بات پر ناراض ہو رہے ہو۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی جو..." وہ اس کے پیچھے بالکونی میں آگئی۔ حیران پریشان سی۔
"تم نے کچھ نہیں کہا مگر تمہیں بلاوجہ میرے سر پر سوار رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں کہاں جاتا ہوں' کس سے ملتا ہوں' کس سے بات کرتا ہوں۔ جب تک تم یہ سب پوچھ نہ لو' تمہیں اطمینان نہیں ہوتا۔"

وہ پتا نہیں کیوں ایک معمولی اور بلاوجہ کی بات کو ایشو بنا کر جھگڑا کرنا چاہ رہا تھا' لیکن اس نے بغیر کسی غلطی کے معافی مانگ لی اور پھر اس نے اسے منا کر ہی دم لیا۔ اسے منا کر وہ واپس کھانے کی میز پر لے آئی تھی۔
مگر یہ صرف اس ایک روز کا قصہ نہیں تھا' وہ نجانے کیوں بات بے بات اس سے الجھنے لگا تھا۔ اس کے خلاف مزاج تو ماہا نے کبھی کچھ نہیں کیا تھا' اب تو وہ مزید احتیاط برتنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے ان الجھے رویّوں کا سبب نہیں جانتی تھی مگر یہ الجھے رویے اسے پریشان بہت کر رہے تھے۔ اگلے پندرہ بیس روز تک حمیر کا مزاج یونہی چڑچڑا اور بدمزاجی سے بھرپور رہا۔ پھر خود بخود ہی اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ اس کے ساتھ نارمل طرح بی ہیو کرنے لگا۔ اس نارمل انداز میں بھی کچھ نہ کچھ ابنارمل تو ضرور تھا۔ کچھ ایسا جسے وہ صرف محسوس کرتی تھی' کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ صرف اس کے قدموں کی آہٹ سے مڑ کر دیکھے بغیر اس کا آنا محسوس کر سکتی تھی تو اس کی آنکھوں میں جھانکتی بیزاری کیوں نہیں پڑھ سکتی تھی۔ وہ بازو اب بھی ہر رات اس کے گرد حلقہ کیے ہوتے تھے' مگر ان میں محبت کی گرمی نہیں بلکہ برف کی سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔
بظاہر دیکھنے میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو غلط لگتا مگر! کا دل خوش نہیں تھا۔ اداسی کی یہ کیفیت پچھلے کئی دنوں سے اس کے ساتھ تھی۔ وہ جس راستے سے' جس طرف سے اس کے دل میں چھپی سوچوں کو جاننے کے لیے اس کے قریب جانے کی کوشش کرتی' وہ وہیں ایک ان دیکھی دیوار کھڑی کر دیتا۔ بظاہر ہنستا' مسکراتا' جیسے سب کچھ سو فیصد ٹھیک ہے۔

☆ ☆ ☆

چھٹی کا دن تھا اور حمیر اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ سامنے ٹی وی بھی چل رہا تھا مگر جتنی دفعہ بھی وہ کمرے میں گئی' اس نے یہی دیکھا کہ وہ نہ اخبار پڑھ رہا ہے' نہ ٹی وی دیکھ رہا ہے اور نہ ہی اسے اس کے آنے اور جانے کی کوئی خبر ہے۔ اس نے کمرے میں ویکیوم کلینر چلایا' ڈسٹنگ کی اور وہ اس کی آمد سے بے نیاز اپنی کسی سوچ میں الجھا رہا۔ وہ کسی بہت گہری سوچ میں گم تھا۔ جو کام ہو گئے تھے' سو ہو گئے تھے اور جو رہ گئے تھے' انہیں ادھورا ہی چھوڑ کر وہ کمرے میں آگئی۔

"کیا بات ہے، تم چپ کیوں ہو، کوئی پریشانی ہے؟"
اس کے ان سوالوں پر وہ خفا ہوتا تھا، اس لیے اس نے ان میں سے کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ بس کسی نہ کسی طرح ان کے بیچ حائل ہوتی اس ان دیکھی دیوار کو گرا دینا چاہتی تھی۔

"تمہارے بال کیسے روکھے روکھے سے ہو رہے ہیں حومی! اتنے خشک اور بے جان سے۔ چلو میں تمہارے سر میں تیل کی مالش کر دوں۔" اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ حمیر خاموش بیٹھا رہا، اس نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل سے تیل کی شیشی اٹھا کر لے آئی اور بیڈ پر اس کے پیچھے بیٹھ کر اس کے سر میں تیل ڈالنے لگی۔

"اب فوراً" جا کر شیمپو مت کر لینا کہ "مجھ سے تیل کی بو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے تک تیل لگا رہنے دینا سر میں۔"

"ماہا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں بولو نا حومی!"

"پہلے تم اپنا کام کر لو۔" اس نے اپنے سامنے پھیلے سارے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور ریموٹ سے ٹی وی بھی آف کر دیا۔ اب کمرے میں سوائے خاموشی کے کچھ نہیں تھا۔ تیل کی مالش کرتے اس کے ہاتھوں کی رفتار سست پڑنے لگی، ان میں خود بخود ہی کپکپاہٹ بھی پیدا ہو گئی۔ وہ اتنی سنجیدگی سے اس سے کیا کہنے والا تھا۔ تیل لگوانے والا یہ کام اس نے کبھی ماہا سے خاموشی سے نہیں کروایا تھا، آج اتنی خاموشی سے بغیر کسی بحث کے کروا رہا تھا۔ اس کے بالوں میں گردش کرتی اس کی انگلیاں ٹھہر گئی تھیں۔ اس نے تیل کی شیشی واپس بند کی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ وہ پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ماہا! جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں، مجھے پتا ہے اس سے تم بہت ہرٹ ہو گی، تمہیں بہت دکھ ہو گا مگر میں کیا کروں، میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔" وہ اس کے تیل لگے ہاتھوں ہی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رسانیت سے بولا۔

"حومی! کیا بات ہے؟" اس کے چہرے کی سنجیدگی اس کا دل دہلا رہی تھی۔ تیز تیز دھڑکتا اپنا دل اسے خود اپنے قابو سے باہر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔

"میں شادی کر رہا ہوں ماہا!" اس نے حمیر کو یوں دیکھا جیسے وہ کسی ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

"ماہا! میں شادی کر رہا ہوں سدرہ آفاق کے ساتھ۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔

اس نے اس بار بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور گم صم سے انداز میں اسے دیکھتی رہی تو وہ مزید بولا۔

"میں اس اتوار کو سدرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں ماہا! تم سن رہی ہو میری بات؟" اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ذرا زور سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی اور وہ کوئی رد عمل کیسے ظاہر کرتی جبکہ اس کی کوئی بات وہ سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

ماہا کے [illegible] میں تھی۔ زندگی کے ابتدائی سال اس نے اپنی ننھیال میں گزارے تھے۔ وہ فقط چھ سال کی تھی جب اس [illegible] انتقال ہو گیا تھا۔ والد اتنی جائیداد چھوڑ گئے تھے کہ وہ آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی لیکن ان کے دوسرے شوہر کے دل میں اتنی وسعت نہ تھی کہ وہ ماہا کو برداشت کر سکتے۔ چودہ سال کی عمر میں ماہا [illegible] نانی کا بھی انتقال ہو گیا تو ماموں اور ممانی نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً اسے اپنی ماں کے پاس واپس آنا پڑا جہاں اسے پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ سوتیلے باپ منظر انکل کا رویہ بھی انتہائی خراب تھا۔ وہ اسکول سے واپس آکر بھوکی پیاسی ٹینک کے پاس بیٹھی اسکول کا کام کرتے کرتے سو جاتی۔ اگر اس کے باپ اتنا پیسہ چھوڑ کر نہ جاتے تو وہ تعلیم بھی حاصل نہ کر پاتی۔ اس کی ماں نے اس رشتہ کو نعمتِ غیر مترقبہ جانا اور فوراً ہی شادی کر دی۔

تیمر کے آگے پیچھے بھی کوئی نہ تھا۔ صرف ایک بڑے بھائی تھے شادی کے بعد ماہا نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ تیمر کا رویہ انتہائی خراب تھا، جبکہ وہ تیمر سے بہت محبت کرتے تھے۔ تیمر نے ماہا کو بتا دیا تھا کہ اس کے لیے سب سے اہم چیز اپنا کیریئر ہے۔ وہ ابھی بچے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا اور یہ کہ ماہا کو بھی جاب کرنا ہو گی۔

ماہا اس کی محبت میں دیوانی ہے اس لیے کہ تیمر اس کی زندگی کا واحد رشتہ ہے۔ اور یہ پہلا گھر تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی تھی۔ وہ اس گھر کو بنانے سنوارنے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرتی ہے۔ اپنی تنخواہ کی ایک ایک پائی گھر پر خرچ کر دیتی ہے۔ تیمر کے آرام و آسائش کے لیے اپنا آرام قربان کر دیتی ہے۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، گھر کی چیزوں کی خریداری، تیمر کے کاروباری دوستوں کی دعوتیں وہ اپنا ہر فرض پوری تن دہی سے انجام دے رہی ہے۔ حالانکہ اس کی دوست کلثوم نے اسے کئی بار ٹوکا اور تیمر کے حوالے سے سخت سست بھی سنائی کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر ذمہ داری اٹھا رہی ہے۔ کچھ ذمہ داری تیمر کو بھی اٹھانا چاہیے لیکن ماہا تیمر کی محبت میں دیوانی ہے اور اسے اندھا یقین ہے کہ تیمر صرف اسے چاہتا ہے۔

ایک خوشگوار دن جب ماہا، تیمر کے سر میں تیل لگا رہی تھی تو تیمر نے انتہائی سپاٹ لہجے میں اسے اطلاع دی کہ وہ آئندہ اتوار کو سدرہ آذق کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔

۲
دوسرا اور آخری حصہ

اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ذرا زور سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ کر بند کیں پھر انہیں دوبارہ کھولا مگر نہ اس کے سُن ہوئے اعصاب بیدار ہو پائے اور نہ اس کے کان وہ سُن پائے جو وہ سننا چاہتی تھی۔

"آئی لو یو ماہا۔"

"تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔"

"ماہا! تم میری زندگی کا سب سے خوب صورت احساس ہو۔"

"میں جانتا ہوں، تمہیں اس بات سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک بھی کہنے کے لیے تیار ہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والی سب سے اچھی لڑکی ہو۔ مگر اپنی اس خوبی کے باوجود تم میری منزل نہیں۔ جو زندگی میں تمہارے ساتھ جی رہا ہوں یہ وہ زندگی نہیں جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ میری منزل سدرہ آذق ہے۔ میں نے تم سے کبھی غلط بیانی نہیں کی اب بھی سب سچ سچ تمہیں بتا رہا ہوں۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے، اسے لگتا ہے کہ اس کے فادر کو ایڈوائزرز اور دوستوں میں وہ بات نہیں جو مجھ میں ہے۔ وہ جانتی ہے میں شادی شدہ ہوں اور وہ پھر بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تم نہیں جانتی ہو کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ کتنے بڑے تھنکر ہیں اس کے ڈیڈی۔ دنیا کے بہترین بینکس اور بڑے بڑے اداروں میں سے کئی میں کام کرنے کا ان کے پاس وسیع تجربہ ہے۔

اس وقت وہ نیویارک میں کس بینک میں کام کر رہے ہیں اور کس پوسٹ پر کر رہے ہیں۔ میں یہ تمہیں بتاؤں تو تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ نیویارک، لندن، پیرس، روم کہاں کہاں یہ تو ان کے شاندار گھر ہیں۔ اتنی اونچی اونچی پوسٹوں پر کام کیا ہے تو نام اور شہرت کے ساتھ ساتھ خوب پیسہ بھی بنایا ہے۔

دنیا بھر کے بڑے بڑے بینکرز اور اقتصادیات کے ماہرین سے ان کے کانٹیکٹس ہیں۔ صرف پاکستان میں نہیں دوسرے ممالک میں بھی کافی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ [illegible] میں ان سے کبھی ملا ہوتا تو وہ مجھے ایک معمولی سا [illegible] سمجھ کر شاید مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے مگر چونکہ ان کی اکلوتی بیٹی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے اس لیے تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ وہ مجھ سے کس طرح ملتے ہیں۔ کس طرح میرے کیریئر کی فکر کرتے ہیں۔ میری ذہانت اور قابلیت کو کس درجہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ آگے میں بے شک اپنی قابلیت ہی کی بنیاد پر جاؤں گا مگر مجھے آگے بڑھنے میں مدد دینے والے، میرے لیے نئی راہیں کھولنے والے وہی ہوں گے۔ ڈیفنس میں اپنے [illegible] تصوراتی عالیشان گھر کی ہم جو باتیں کیا کرتے تھے اور [illegible] نہیں، کبھی ہم دونوں مل کر بنا بھی پاتے یا نہیں، ڈیفنس [illegible] اسی فیز میں ویسا گھر بلکہ اس سے بھی زیادہ شاندار ایک گھر انہوں نے سدرہ کے نام کر رکھا ہے۔ ان کے اثر و رسوخ، ان کے پاورز تم سوچ ہی نہیں سکتیں ماہا! اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ میرا کیریئر میرے لیے کتنا اہم ہے تم جانتی ہو میں ایک کامیاب نہیں کامیاب ترین انسان بننا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے سدرہ کا ہاتھ تھامنا ہی ہو گا۔"

اس کا لہجہ بہت نرم اور بڑا شیریں تھا۔ اس کی نگاہوں میں بھی پیار اور نرمی تھی۔ قتل کرنے کا یہ ایک نیا انداز تھا۔

وہ ابھی بھی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور منجمد احساسات کے ساتھ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے کوئی بھی لفظ نہیں نکلا تھا اور نہ ہی ساکت بیٹھے اس کے وجود میں کوئی جنبش ہوئی تھی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد تھی۔

"میں کل یہاں سے شفٹ ہو رہا ہوں ماہا! اتوار کو ہماری شادی ہے، بیچ کے یہ چھ دن میں کسی ہوٹل میں گزار لوں گا۔ میں ایسا صرف تمہاری وجہ سے کر رہا ہوں اگر اگلے چھ دن یہاں سے گیا تو تمہیں یہ سوچ کر زیادہ دکھ ہو گا کہ میں چند گھنٹوں بعد شادی کر لینے والا ہوں۔"

"ہماری شادی؟"

ہماری؟ یہ کون تھی جو اس کے شوہر کے ساتھ مل کر ایک "ہم" بنا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس سے اٹھا اور پھر بیڈ کے بائیں جانب کی الماری کھول کر اس میں سے اس نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اس کا سکتہ جیسے ایک دم ہی ٹوٹا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

"جو بھی یہ سب جو ابھی تم نے کہا۔ یہ شادی، یہ سدرہ آذق۔ یہ سب جھوٹ ہے نا؟ ہے نا تم مجھے تنگ کر رہے ہو نا؟" وہ اس کے کندھوں کو جھنجھوڑ کر اس انداز سے بولی جیسے وہ ابھی ہنستے ہوئے یہ کہہ ہی دے گا کہ "ہاں میں مذاق کر رہا تھا۔"

"کہو جو بھی کہ یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے ماہا! میں اور سدرہ شادی کر رہے ہیں۔"

آہستہ آواز اور نرم لہجے میں بولا۔

"تم ایسا کس طرح کر سکتے ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔ تم کسی سدرہ سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اتنی دفعہ تم نے یہ بات مجھے بتائی ہے اور ابھی، ابھی ہماری ویڈنگ اینورسری پر، تب تم نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ صرف سات مہینے تو گزرے ہیں اس دن کو جو تم نے کہا تھا، تم نے اس رات کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ روتے ہوئے یوں چلا رہی تھی جیسے اپنے حواسوں ہی میں نہ ہو۔

"ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن ماہا۔"

"ہم ایک دوسرے سے اتنی بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی تیسرا کیسے آ سکتا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی سدرہ آذق کبھی بھی نہیں آ سکتی۔"

اس نے تیمر کو "لیکن ماہا" سے آگے کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔ اس کے لیے بس اس کا یہ کہہ دینا کافی تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی تھی۔

"پھر سے ایسا مذاق مت کرنا جو بھی! تمہارے لیے یہ مذاق ہو گا مگر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے پھانسی کے تختے پر کھینچ کر لے جا رہا ہو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں، میں تمہارے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں ماہا! مگر صرف محبت میرے

[illegible] ہیں۔ محبت سے بڑھ کر میرے لیے زندگی میں اور [illegible] ہے۔ یہ فیصلہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ بہت [illegible] ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے تمہاری فکر تھی، تمہارا خیال تھا، پورے دو مہینے میں اس الجھن میں جتلا رہا کہ کیا کروں۔ میں اپنے خوابوں کی قربانی دے کر فقط محبت کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔ میرے سب خوابوں کی تعبیریں مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہیں اور میں انہیں نظرانداز نہیں کر سکتا۔" وہ اتنی دیر سے مسلسل جس نرمی و اپنائیت سے بات کر رہا تھا، ابھی بھی اس کا لہجہ ویسا ہی تھا۔

اپنے سینے پر سر رکھ کر روتی اس لڑکی کو اس نے دھکیل کر دور نہیں ہٹایا تھا، ہاں مگر ہمیشہ کی طرح اپنے بازوؤں کے حلقے میں بھی نہیں لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ان کیسوں کو پکڑے ہوئے تھے جنہیں وہ ماما کے قریب آنے سے پہلے بیڈ پر ڈالنا چاہتا تھا۔

ڈھائی سال کا ساتھ تھا، اتنا حق تو رکھتی تھی وہ لڑکی کہ اسے وہ کار ابڑی عزت کے ساتھ جائے۔

"ہم ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خوش ہیں۔ ہر طرح سے آئیڈیل زندگی، آئیڈیل گھر، ہم میں تو کبھی کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔" وہ ابھی تک بھی بے یقینی سے یقین کی طرف نہیں آ پائی تھی۔

"میں خوش نہیں تھا ماہا! یہ زندگی کبھی بھی میرا خواب نہیں رہی۔ گن گن کر پیسے خرچ کرنا اور مہینوں کی بچت کے بعد اپنی مرضی کی کوئی چیز لے سکنا۔"

وہ "ہے" اور "ہیں" کہہ رہی تھی اور وہ "تھا" اور "تھی" وہ اس کے پاس کھڑے ہوئے ہی اسے اپنے ماضی کا حصہ قرار دے رہا تھا۔ جس شخص کی محبت میں اس نے اپنی ہستی مٹا دی تھی، جسے خوش رکھنے کے لیے اپنے وجود کو فراموش کر چکی تھی، وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں۔ جس عورت کا شوہر یہ کہہ دے کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں، اس سے بڑھ کر بدنصیب عورت اور کون ہو گی۔

اس نے ثمیر کے سینے پر رکھا اپنا سر اوپر اٹھایا اور آنسو برساتی آنکھوں سے بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ جو اس کی زبان نے کہا تھا وہی اس کی آنکھوں میں بھی لکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس سے دور ہٹی تو وہ پرسکون سا ہو تا دوبارہ اپنے کپڑے الماری سے نکالنے لگا۔ [illegible] سے ٹیک لگا کر کھڑی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی [illegible] اپنے سارے کپڑے باہر نکالنے کے بعد اس نے اپنا [illegible] سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ نہانے چلا گیا۔ نہا کر آنے کے بعد وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سارا سامان لاؤنج میں ڈھیر کرنے کے بعد پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ اس نے مین دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز ضرور سنی تھی۔ کافی دیر بعد وہ واپس آیا۔

"ثمیر! پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ پلیز تم جیسا [illegible] کہو گے میں ویسا کروں گی۔ میرا پروموشن تو ویسے ہی ہو گیا ہے، میری سیلری بڑھ گئی ہے تمہیں پتا ہے ناں۔ پھر میں شام کو کوئی اور جاب بھی کر لوں گی اور ہفتہ اور سنڈے کو بھی کچھ [illegible] لیا کروں گی۔ کوئی ایسا کام جس میں اچھے پیسے مل جائیں۔ میں اب تمہیں بالکل بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ یقین کرو، میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ تمہیں یقین ہی نہیں آئے گا کہ ماہا اتنی محنت کر سکتی ہے۔ بس تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور جنونی انداز میں کارٹن میں رکھا مانیٹر واپس باہر [illegible] لگی۔

"ماہا! بند کرو یہ پاگل پن۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر اس نے اپنے غصے کو قابو میں کیا اور دوستانہ انداز اختیار کر کے بولا۔

"تم جا کر منہ ہاتھ دھوؤ اور کھانا کھاؤ۔ شام کے چھ بج رہے ہیں اور تم دوپہر سے ایسے ہی بیٹھی ہو، لنچ میں بھی کچھ نہیں لیا۔ جاؤ جا کر کھانا کھاؤ اور ایک کپ گرم گرم چائے پیو۔ اس سے تم بہت بہتر محسوس کرو گی۔" اس دوستانہ اور نرم لہجے میں یہ تنبیہہ چھپی ہوئی تھی کہ وہ خیر سے ماہا کو اسے اس کا کام ختم کرنے دے۔

"ثمیر! اس طرح سے تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ تمہیں مجھ سے شکایت کیا ہے؟"

"پھر وہی بات۔ میں کہہ تو چکا ہوں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ اب تم بے کار میں مجھے پریشان مت کرو۔" اس بار اس کے لہجے میں نرمی کا عنصر قدرے کم تھا۔

"اور تمہارے بغیر میرا کیا ہو گا؟ تمہارے سوا اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں۔ تم میرا واحد سہارا ہو، میرا واحد [illegible] ہو۔ میں تمہارے بغیر اکیلی کیسے رہوں گی، تم نے یہ [illegible]

[illegible] ہے؟" وہ ایک بار پھر زور زور سے رونے لگی۔

"تم اپنی ممی کے پاس چلی جانا۔ وہ تمہاری ماں ہیں۔ جتنا [illegible] تم انہیں سمجھتی ہو، وہ ایسی ہوں گی نہیں۔ پھر تم اپنا [illegible] ہو، کون سا ان کے گھر پر بوجھ بن کر رہو گی۔" کتنا سادہ [illegible] سا حل تھا یہ۔ واقعی اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ [illegible] اس ماں کے گھر جا سکتی ہے، جو بطور مہمان اپنے گھر [illegible] اسے ایک کپ چائے تک نہیں پلا سکتی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اپنی پیکنگ میں مصروف رہا۔ اب وہ اس کے [illegible] ہی کارپٹ پر گھٹنوں پر سر رکھے بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے کچن سے شامی کبابوں کے تلے جانے کی خوشبو آئی۔ اس کے کچھ دیر بعد چائے کی خوشبو۔

"میں نے کباب فرائی کیے ہیں، اگر تمہیں کھانا ہے تو [illegible] اور بریڈ ٹیبل پر ہی رکھے ہیں اور کیتلی میں چائے [illegible] ہے۔"

وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر کمرے میں واپس آ گیا [illegible] اسے مخاطب کر کے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی [illegible] فون کر لیا۔ وہ کارپٹ پر ابھی بھی اسی جگہ، اسی انداز میں [illegible] تھی، اس کی آنکھوں سے ابھی بھی قطرہ قطرہ کر کے لہو [illegible] رہا تھا۔ خوش فہمیوں میں ڈوبا دل ابھی حقیقتوں کو جان [illegible] نہ پایا۔

"ہیلو۔" ثمیر کے موبائل پر کال آئی تھی اور وہ ایک [illegible] میں چائے کا کپ اور دوسرے میں موبائل لے کر [illegible] سے نکل گیا تھا۔ اس کی آواز وہ باآسانی سن سکتی [illegible]

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟" اس کا لہجہ بہت [illegible] اور آواز خوشی سے بھرپور تھی۔

"نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ تم میری فکر مت کرو۔" "ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ! میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں جس کے [illegible] تم صبح صبح سیر ن آ گئی۔ میں گیارہ، بارہ بجے تک آفس [illegible] ہوں گا۔ ہاں بس پھر کل دوپہر ہی میں تم سے ملاقات ہو [illegible] اوکے، ٹیک کیئر بائے۔"

کیا کیا جادو تھا اس لڑکی میں؟ ڈھائی سالوں کی اس کی [illegible] بھری رفاقت کو اس نے محض دو ماہ میں خاک کر ڈالا۔ [illegible] جوڑا اس کا آشیانہ کس آسانی سے اس نے اجاڑ [illegible] تھا۔

"تمہیں تو اور بہت سے مل سکتے ہیں۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ جسے چاہے، خرید لو۔ مگر میری زندگی میں تو فقط یہی ایک شخص ہے۔ اسے مجھ سے مت چھینو۔ یہ مجھ سے چھن گیا تو میں کس طرح جی پاؤں گی؟" اس کے جی میں آئی کہ وہ ابھی اور اس وقت جا کر اس لڑکی سے ملے۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے پڑیں تو ہاتھ جوڑے۔ اس کے پاؤں پکڑنے پڑیں تو پاؤں پکڑ لے۔ اس کی منت کرے۔

وہ کمرے میں واپس آیا۔ موبائل میز پر رکھا، پھر ایک نظر اس پر ڈالی اور سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی رہی اور وہ بیڈ پر لیٹا رہا۔ جس شب کو اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ ہاتھ پکڑ کر روک لے۔ وہ اتنی تیزی سے گزر رہی تھی کہ سویرا ہونے میں کچھ وقت رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی، سو کر اٹھے گی تو سب کچھ پہلے جیسا ہو گا، یہ ڈراؤنا خواب سو کر اٹھنے پر اپنی موت آپ مر جائے گا، مگر نیند آنکھوں میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی

سنجیو کپور کی کتاب "کھانا خزانہ" کی کامیابی
کے بعد لذیذ کھانوں کی ترکیبیں
انڈین کھانے
سنجیو کپور
قیمت : 250/- روپے
ڈاک خرچ : 30/- روپے
آج ہی گھر بیٹھے منگوانے کے لیے
280/- روپے کا منی آرڈر یا ڈرافٹ
ارسال کریں۔
منگوانے کا پتہ
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
37۔ اردو بازار، کراچی
فون: 2216361

ساری باتیں چھوڑ کر وہ گھبرا کر اٹھی اور تیزی سے اس سوٹ کیس میں سے کپڑے واپس نکالنے لگی۔

"بابا۔" وہ اس کے مڑ کر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"میں کل دوپہر سے تمہارا پاگل پن برداشت کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ بہت اچھی طرح گزارا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح کسی تلخی اور کسی جھگڑے کے بغیر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں مگر تم مجھے رویہ بدلنے پر مجبور کر رہی ہو۔ تم ایک پڑھی لکھی ماڈرن لڑکی ہو لیکن بالکل کسی ان پڑھ اور جاہل عورت کی طرح ری ایکٹ کر کے ماحول کو خراب کر رہی ہو۔"

"میرا شوہر مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کرنے والا ہے۔ نہیں ہوں میں پڑھی لکھی، نہیں ہوں میں ماڈرن، میں جاہل ہی ٹھیک ہوں۔" کاش وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ بات کہہ پاتی۔

سوٹ کیس واپس بند کرنے کے بعد وہ نہانے چلا گیا۔ نہا کر وہ آکر اسی اہتمام اور اسی انداز سے تیار ہونے لگا جیسے روز ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے کمرے سے اپنا سوٹ کیس باہر نکالا، پھر بیگ۔ جیسے ہی اس نے آخری کارٹن کمرے سے باہر نکالا وہ فوراً اس کے پاس آئی اور اس کے بازو کو زور سے پکڑ کر منت بھرے لہجے میں بولی۔

"تمہیں اس سے شادی کرنی ہے کر لو مگر مجھے چھوڑ کر مت جاؤ سمیر! میں تم دونوں کی زندگی میں بالکل مداخلت نہیں کروں گی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ جہاں اب تم رہو گے وہیں میں بھی رہ سکوں۔" سمیر نے اپنا بازو بہت ناگواری سے چھڑایا اور اس کی بات کا جواب دیے بغیر کارٹن گھسیٹتا کمرے سے باہر آگیا۔ وہ روتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

"تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔" وہ اپنے پیچھے آتی اس روتی اور التجا کرتی آواز کو نظر انداز کر کے اپنا سارا سامان ایک ایک کر کے مین دروازے سے نکال کر لفٹ کی طرف لے جا کر رکھنے لگا۔

"دیکھو تو تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔" اس نے اس کی قمیص پیچھے سے پکڑا۔ جھنکارنے کے سے انداز میں اس سے جھٹک دیا۔ ایک جھٹکے سے اپنی قمیص اس کی گرفت سے چھڑا لی۔ انتہائی سخت لہجے میں اسے وارننگ دی۔

"تم نے اگر یہ ڈراما بند نہ کیا اور مزید ایک قدم بھی میرے پیچھے آئیں تو میں تمہارا بالکل لحاظ نہیں کروں گا۔" وہ ڈر کر، سہم کر، ٹھٹک کر، خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی اور وہ اپنا بیگ دروازے کے اندر سے اٹھا لفٹ کی طرف چلا گیا۔

اس کا ذہن پھر سے ماؤف ہونے لگا، اعصاب منجمد ہونے لگے، احساسات پر پھر سے برف جمنے لگی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ کسی پاگل عورت کی طرح اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ واپس بند کیا اور وہیں دروازے کے پاس ہی فلور میٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے اسی جگہ بیٹھے کئی گھنٹے ہو چکے تھے جب اس کے گھر کی خاموشی کو فون کی بیل نے توڑا۔

"مانتی ہو میرے سینس آف ہیومر کو؟ کیسا پریکٹیکل جوک کیا تمہارے ساتھ۔ ذرا گھبرا کر دکھایا تم تھوڑی سی دیر میں۔" اس نے اپنے کانوں کے پاس مانوس آواز سنی۔ وہ دیوانہ وار پاگلوں کی طرح فون کی طرف بھاگی۔ اتنا اندھا دھند کہ سامنے رکھی میز بھی اسے نظر نہیں آئی، بہت بری طرح وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر گری، اس کی ناک اور ہونٹ پر چوٹ لگی تھی، تکلیف کا احساس بھی ہوا تھا مگر وہ اس چوٹ پر دھیان دیے بغیر فون کی طرف لپکی اور جھپٹ کر ریسیور کان سے لگایا۔

"حوری!" یہ نام پکارتے ہی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔

"میں بول رہی ہوں بابا۔" وہ ممی کی آواز تھی۔

"تمہیں کیا سمیر کے فون کا انتظار تھا؟"

"نہیں، ویسے ہی میں سمجھی شاید اس کا فون ہو۔" آنسوؤں پر قابو پا کر وہ نارمل انداز میں بات کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے، ڈیڈی کو بھی، ممی کو بھی۔

"بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا، اس لیے میں نے سوچا تمہاری خیریت پوچھ لوں۔ تمہارے آفس فون کیا تو پتا چلا تم آج وہاں آئی نہیں ہو۔ کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"میری طبیعت ٹھیک ہے ممی! بس ویسے ہی آج گھر میں کچھ کام تھا اس لیے چھٹی کر لی۔ آپ کیسی ہیں؟ اور انکل اور عبداللہ کیسے ہیں؟"

"ممی! میں بالکل ٹھیک نہیں۔ میرا گھر اجڑ گیا۔ کیسی ماں ہو، تمہیں میرے دکھ کیوں پتا نہیں چلتے؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ظفر بھی ٹھیک ہیں۔ وہ میں نے تم سے عبداللہ کی جاب کے لیے بات کی تھی، گریجویشن کب کا ہو گیا اس کا، پھر اب تو اس نے کمپیوٹر کے بھی اتنے سارے کورسز کر لیے ہیں۔ دیکھی کوئی جگہ تم نے اس کے لیے اپنے آفس میں؟"

"جی ممی! میں کوشش کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔" اس سے بالکل بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اپنی تمام تر طاقتوں کو جمع کر کے وہ لفظوں کو ادا کر رہی تھی۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیاں خون آلود ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو۔ خون صاف کرنے کے لیے ٹشو پیپر لینے وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس آئی۔ وہاں بہت سے جھوٹے برتن رکھے تھے۔ ایک پلیٹ میں ڈھک کر رکھے کباب اور اس کے قریب ڈبل روٹی، چائے کے خالی کپ۔ وہ ٹشو پیپر لینا بھول چکی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ ان برتنوں کو چھو رہی تھی۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کے ایک ایک کونے میں پاگلوں کی طرح روتی ہوئی پھر رہی تھی۔ نہ زمین پھٹی تھی، نہ آسمان سر پر گرا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا، فقط اتنا کہ ایک گھر، ایک رشتے اور ایک محبت کی محبت میں خود کو مٹا دینے والی وہ لڑکی پھر سے تنہا رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں میرے بغیر نیند آجاتی ہے؟ میں تو نہیں سو پاتی تمہارے بنا، میں تو نہیں جی پاتی تمہارے بنا۔ تم کس طرح جی رہے ہو میرے بغیر؟ پلیز واپس آجاؤ۔"

وہ روتے سسکتے اس کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔

آج رات وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس کا حق کسی اور کو دینے والا تھا۔

گزرے چھ دنوں میں اس نے کئی مرتبہ اس کا موبائل نمبر ملایا تھا، اس کے آفس کا نمبر ملایا تھا اور وہ ہر بار اس سے ہنس کر بات کر رہا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی شاید وہ اسے روک پائے لیکن وہ اس سے بات نہیں کر پائی تھی اور وہ رات آگئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ کبھی بہت زور زور سے چیخ کر، کبھی بغیر آواز کے۔

"مجھے بہت اچھا لگے گا حوری! جب ایک روز تم مجھ سے کہو گے کتنی جلدی پچیس سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا بابا!"

بہت جلدی ہے پچیس سال گزروانے کی۔ پچیس سال بعد تو تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔" اس رات جب وہ یہ باتیں سمیر سے کر رہی تھی۔ تب کاتب تقدیر اس کی سادگی پر کس قدر مسکرایا ہوگا۔ اس کی قسمت میں تو اس رات کے بعد پچیس ماہ کی رفاقت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس شخص کی۔ ساری رات روتے رہنے کے بعد صبح کے قریب اس کی آنکھ لگی تھی تو صبح اپنے مخصوص وقت پر وہ ہڑبڑا کر جاگ گئی تھی۔

"حوری! اٹھو۔" روانی میں بولتے ہوئے وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ گزرے سات دنوں کی طرح اسے یاد دلانا پڑا کہ وہ کمرے میں تنہا ہے۔

"تمہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؟ میری طرح کون تمہارا خیال رکھتا ہوگا، کون صبح میں فریش جوس لا کر دیتا ہوگا، رات میں کون تمہارے لیے دودھ کا گلاس لاتا ہوگا۔" وہ ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی تھی۔

دن پر دن گزر رہے تھے، اسے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلے، باہر کی دنیا میں گئے پورے بیس دن ہو چکے تھے۔ بیس دنوں سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں قید کسی مردے کی سی زندگی جی رہی تھی۔ اس کے آفس سے اس کی غیر حاضری کے اگلے ہی روز فون آیا تھا۔

اس نے اپنی کسی نجی مصروفیت کا کہہ کر آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ اس نے کبھی اتنی لمبی تو کیا، محض ایک دن کی چھٹی بھی کبھی نہیں کی تھی۔

انیس دن اس نے یونہی مردوں کی سی حالت میں گزارے مگر بیسویں دن اسے دودھ اور چینی کے بعد پتی بھی ختم ہونے کا احساس ہوا تو وہ چونکی۔ فریج میں رکھا دودھ اور خشک دودھ کئی روز ہوئے کب کے ختم ہو چکے تھے۔ وہ کتنے دنوں سے بغیر دودھ اور بغیر شکر کے چائے پی رہی تھی۔ وہ ابھی زندہ ہے، اسے خود اپنے آپ کو یاد دلانا پڑا۔ نہ یہ اپارٹمنٹ اس کی قبر تھا اور نہ وہ اس میں بس مری ہے۔ وہ

زندہ تھی۔ ابھی اس مہینے کے بارہ دن باقی تھے اور اس کے پاس صرف تین ہزار روپے تھے۔ تین ہزار روپے اس کی کل کائنات اس کا کوئی بینک بیلنس نہیں تھا۔ اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔

تین ہزار روپے کا کل اثاثہ رکھتے ہوئے وہ اپارٹمنٹ میں بند اور کتنے دن رہ سکتی تھی؟ اسے پیٹ بھرنے کو اناج بھی چاہیے تھا، تن ڈھانپنے کو کپڑا بھی چاہیے تھا اور سر چھپانے کو چھت بھی چاہیے تھی، اسے یہ سب کچھ چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ زندہ تھی اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے اسے دوبارہ دنیا سے اپنا رشتہ جوڑنا تھا۔

اکیسویں روز صبح وہ اپنے آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنے دنوں بعد خود کو دیکھا۔ اس کی حالت واقعی کسی مردہ جیسی ہی لگ رہی تھی۔ اندر دھنسی ہوئی چمک اور زندگی سے عاری آنکھیں، آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، پیلا ہلدی جیسا چہرہ ایسے جیسے ابھی ابھی کسی سنگین بیماری سے اٹھی ہو۔ وہ بھی آفس جانے کے لیے اتنے اہتمام سے تیار نہیں ہوتی تھی جتنی آج ہو رہی تھی۔

بہت فریش اور چاق و چوبند اگر وہ سب کو نہ بھی لگے تو کم از کم ایسی کمزور اور مرجھائی ہوئی بھی نظر نہ آئے کہ کوئی اس بارے میں کچھ پوچھے۔ وہ چلا گیا تھا تو کیا ہوا، اسے واپس تو اس کے پاس آنا تھا اور وہ اس کی واپسی سے پہلے کا یہ سارا وقت اس طرح گزارنا چاہتی تھی کہ اس کے کسی بھی جاننے والے کو کچھ پتا نہ چل سکے۔ کچھ دنوں میں وہ واپس آ جائے گا مگر پھر کلثوم اور فائز جیسے اس کے مخلص دوست عمیر کو کبھی بھی ویسی عزت نہیں دیں گے، پھر بے کار میں کیوں انسان اپنی گھریلو باتیں کسی کو بتائے اور جگ ہنسائی کروائے۔

وہ آفس آ گئی تھی۔ اپنی ظاہری حالت کو قیمتی لباس، بہترین میک اپ اور دلآویز مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لیا تھا مگر اپنے اندر کی دنیا کا کیا کرتی؟ اس سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے رخشی بیٹھی تھی اور وہ ہمدانی گروپ کی جانب سے وقت پر پے منٹ نہ ہونے کے حوالے سے اسے لیٹر ڈکٹیٹ کروا رہی تھی۔

"میں خوش نہیں تھا ماہا! میں تمہارے ساتھ خوش نہیں تھا۔"

"تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔

"I love you so much"

"جی میم!" رخشی Subject لکھ چکنے کے بعد اگلے جملوں کی منتظر تھی۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ ہمدانی گروپ کے ذمہ واجب الادا رقم... اس نے اس پر توجہ مرکوز رکھنے کے لیے سامنے رکھے کاغذوں پر نگاہیں جما دیں۔

"تم میری منزل نہیں۔ میری منزل سدرہ ترقی ہے۔" اسے رخشی بھی نظر آ رہی تھی اور اس کی منتظر نگاہیں بھی، مگر اسے بولنا کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"ہیلو اکو۔" فائز حسب عادت دروازے پر سے تیز آواز میں بولتا اندر آ گیا، ہاتھ میں ایک ڈائری لیے ہوئے۔ "میں تمہارا پرنٹر استعمال کر سکتا ہوں؟ میرا پرنٹر اس وقت روٹھی محبوبہ کی طرح اینٹھا ہوا ہے۔"

"او شیور۔" اس کے چونچال موڈ کے جواب میں وہ جبراً مسکرائی اور پھر دوبارہ رخشی اور اپنے سامنے رکھے کاغذوں کو دیکھتے ہوئے اسے خط ڈکٹیٹ کروانے لگی۔

اسے اپنے سامنے لکھے لفظوں کو پڑھنے کے باوجود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"جی میم آگے۔"

"میں شادی کر رہا ہوں ماہا! تم میری منزل نہیں، تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں تھا۔ تم میری زندگی کا سب سے خوب صورت احساس ہو۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی میم!" رخشی متفکر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ نہیں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ اصل میں کل ساری رات لائٹ نہیں تھی۔ نیند ڈسٹرب رہی ہے، اس لیے اب بے تحاشا تھکن کا احساس ہو رہا ہے۔" وہ اسے جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔

"آپ تھوڑا ریسٹ کر لیں۔ میں لنچ کے بعد آ جاؤں گی ڈکٹیشن لینے۔"

"نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آئی ایم فائن۔ کراچی میں رہنا ہے تو بجلی غائب اور پانی غائب والے مسائل تو بھگتنے ہی پڑیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے فائز گردن ترچھی کر کے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے گہری نگاہوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔

"اچھا پھر میں آپ کے لیے ایک کپ چائے لے آتی

ہوں۔" رخشی اٹھ گئی فائز اب بالکل سیدھا کھڑا بغور اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔" اس کی خاموشی اور ان نگاہوں کی گہرائی سے بچنے کی خاطر غیر سنجیدگی سے ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم آج خوب صورت بہت لگ رہی ہو اس لیے۔"

"سدھر جاؤ ورنہ زارا سے واقعی کسی دن پٹو گے۔" اس کی کچھ کھوجتی، متجسس سی نگاہیں اور گہرا لہجہ اسے بری طرح ڈسٹرب کر رہا تھا۔ فائز جیسے ہی اس کے کیبن سے نکلا اس نے سکون کا سانس لیا۔

☆ ☆ ☆

اسے آفس دوبارہ جوائن کیے اس روز دسواں دن تھا۔ پہلے دن غیر حاضر دماغی اور کچھ الجھے انداز کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس نے پھر کسی دن کچھ ایسا نہیں ہونے دیا تھا جو لوگوں کو چونکائے۔ لنچ ٹائم میں حسب معمول وہ ایک ناول دیکھنے کے ساتھ ساتھ سینڈوچ کھانے اور کولڈ ڈرنک کے سپ لینے میں بھی مصروف تھی۔ اپنے موبائل پر کالنگ نمبر دیکھ کر اس نے بے دھیانی کے عالم میں کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو، ہیلو ماہا! میں عمیر بول رہا ہوں۔" سینڈوچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ناول پر گر پڑا۔

"ماہ!" ہونٹوں سے اتنے دھیمے انداز میں یہ ہوا کہ شاید دوسری طرف سنا بھی نہیں جا سکتا۔

"ماہا! میں عمیر بول رہا ہوں۔" (کیا ان کا برسوں کا ساتھ اتنا کمزور اور اتنا بے معنی تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے اپنا تعارف کروانا پڑے۔)

"میں عمیر بول رہا ہوں۔" (میں تمہیں تمہاری آواز سے پہچانتی ہوں۔ یہ تعارفی اور پر تکلف جملے بول کر کیوں مجھے پرایا بنا رہے ہو؟) اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں اور حلق میں ایسا پھندا لگا تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔

"ماہا؟" اس کی خاموشی سے تنگ آ کر اس نے پھر سے اس کا نام لیا۔

"میں پل پل جی رہی ہوں، پل پل مر رہی ہوں۔ تمہارے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا، عمیر! واپس آ جاؤ۔"

"تم کیسے ہو عمیر؟" منہ سے آواز نکلنے کی دیر تھی، اس کی آنکھوں میں ٹھہرا پانی قطرہ قطرہ کر کے اس کے چہرے اور گردن کو بھگو تا میز پر گرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس کی آواز بہت ہموار اور نارمل تھی۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اسی کے لیے میں نے فون کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تمہارا لنچ بریک ہو گا، تو جو باتیں میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، وہ تمہیں ڈسٹرب کیے بغیر آرام سے کر سکتا ہوں۔" اس کے جملے جذبات سے مکمل طور پر عاری تھے۔ وہ خاموش بیٹھی میز پر تیزی سے گرتے اپنے آنسوؤں کو ایک ٹک دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"یہ باتیں میں تم سے اسی روز کرنا چاہتا تھا مگر تب تم اتنی حساس اور اس قدر ایموشنل ہو رہی تھیں کہ ہم دو پڑھے لکھے، میچیور افراد کی طرح ان تمام امور پر بات کر ہی نہیں پائے تھے۔ میں اتنے دن قصداً ٹھہرا رہا کہ تم اس جذباتی فیز سے باہر نکل آؤ۔ اب ایک مہینہ ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے تم اس جذباتی فیز سے نکل کر ساری صورت حال کو حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کر چکی ہو گی تو اب ہمیں تمام تصفیہ طلب امور پر بات کر لینی چاہیے۔" وہ سیدھا کام کی بات کی طرف آیا، سنجیدگی و بردباری سے بولا۔ اس کے آنسوؤں کے بہنے کی رفتار میں یک دم ہی شدت آ گئی تھی۔

"میں ڈیوورس اور تمہارے مہر کی بات کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک لاکھ روپے کا چیک بھجوا دوں یا تم کیش لو گی؟" یہ ایک شوہر کی اپنی بیوی سے نہیں، ایک بینکر کی اپنے کلائنٹ سے بزنس کمیونیکیشن تھی۔

غیر جذباتی اور مدلل۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ اس کے آنسو اسے کچھ بولنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ صرف یہ کوشش کیے جا رہی تھی کہ اس کی سسکیوں کی آوازیں لائن کے دوسری طرف تک نہ پہنچیں۔

"میں اور سدرہ دس پندرہ دن میں امریکہ جا رہے ہیں، میں وہاں WHARTON میں ایڈمیشن لے رہا ہوں۔ ڈاکٹریٹ کا ارادہ ہے میرا۔ جانے سے پہلے میں اس معاملے کو نمٹا لینا چاہتا ہوں۔ تم جس طریقے سے کہو گی، میں تمہارا مہر اس طرح ادا کر دوں گا۔ باقی ہمارے اپارٹمنٹ میں جو فرنیچر وغیرہ تھا، وہ سب تم بخوشی فروخت

کر سکتی ہو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پورے ایک منٹ تک بھی جب وہ کچھ نہ بولی تو اس نے اسی سنجیدگی و متانت سے اسے مخاطب کیا۔

"میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔

"مجھے طلاق نہیں چاہیے۔" بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بغیر روئے یہ جملہ نہیں بول پائی تھی۔ وہ اب اس سے اپنی سسکیاں چھپانے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"لیکن بابا! یہ صحیح نہیں ہے۔ آخر تمہاری بھی ایک زندگی ہے، تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا پورا پورا حق ہے۔"

"میں نے کہا نا، مجھے طلاق نہیں چاہیے۔" وہ روتے ہوئے چلائی۔

"میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں؟ مجھے طلاق دیے بغیر بھی تو تم سدرہ آفاق کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہو۔ میں کبھی بھی تمہارے پاس کوئی حق جتانے نہیں آؤں گی، کچھ مانگنے نہیں آؤں گی۔"

"تم ابھی بھی اس جذباتی کیفیت سے نہیں نکلیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"اوکے، ایز یو وش۔ لیکن جس وقت بھی تم اس جذباتی کیفیت سے باہر نکل آؤ تو مجھ سے فوراً رابطہ کرنا۔ میرے آفس فون کر کے تم احسان یوسف سے میرا امریکہ کا ایڈریس اور فون نمبر لے سکتی ہو۔ اس حماقت سے نکل کر اپنی زندگی کے بارے میں سوچو گی اور کسی اچھے انسان کا ہاتھ تھام لو گی تو مجھے واقعی بہت خوشی ہوگی۔ اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔ اللہ حافظ۔" بہت فیاضی کے ساتھ اسے اس کی زندگی کے بارے میں سوچنے کی دعوت دے کر رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہر چیز گردش کرتی، گول گول گھومتی نظر آ رہی تھی۔ آنسوؤں کے طوفان سے اس پار ہر چیز دھندلی تھی، ہر منظر غیر واضح اور مبہم تھا۔

"وہ پورا کا پورا میرا ہے۔ اس کی محبت میری ہے، اس کی وفائیں میری ہیں۔ تمہیں کیا معلوم، وہ مجھ سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا ہے۔" کلثوم سے کہے اس کے لفظ خود اسی پر ہنس رہے تھے۔ اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ اب زندگی میں گنوانے کو بچا کیا تھا؟ وہ سب کچھ ہار گئی تھی اور اس کے پاس پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر میکے کے نام کا کوئی آسرا نہیں تھا۔

شکر تھا کہ یہ لنچ ٹائم تھا۔ بیشتر افراد لنچ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے اور اس کے کیبن کا دروازہ بھی بند تھا۔ رسوائی کا خوف تو ابھی بھی تھا نا۔ اپنی ہار وہ لوگوں سے ابھی بھی چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔

"مسز حمیر! میٹنگ سے پہلے آپ ذرا یہ فائل اسٹڈی کر لیں۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا شوہر مجھ سے اپنے نام کا یہ حق بھی واپس لینے کی بات کر رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے یہ ایک حق اپنے پاس رکھ پائی ہوں، باقی تو سب کچھ گنوا دیا۔"

"جی سر! میں اسے دیکھ لوں گی۔" وہ فائل لے کر فنانس ڈائریکٹر کے آفس سے نکل آئی۔ سامنے سے آتے فائز کو وہ نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتی تھی مگر وہ اس کے عین سامنے آ کر رک گیا۔

"بڑی باس کی تیچہ گیری ہو رہی ہے۔ لگتا ہے بابا احمد علی کا پروموشن ہونے والا ہے۔"

"بابا حمیر رضا۔" اتنے سخت لہجے میں اس نے اس کی تصحیح کی کہ ایک پل کو اپنے لہجے کی سختی پر اسے خود تعجب ہوا۔

"او ہاں، بابا حمیر رضا۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"روانی میں منہ سے نکل گیا۔" وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ پھر سنجیدہ اور شوخ و شریر تھا مگر نگاہیں حد درجہ سنجیدہ۔ اس کے چہرے پر کچھ ڈھونڈتی کھوجتی ہوئی۔

"تمہیں خود تو کوئی کام دام ہے نہیں مگر میں بہت بزی ہوں۔ مجھے ابھی یہ فائل اسٹڈی کرنی ہے۔" وہ اس سے آگے بڑھ کر تیزی سے اپنے کیبن کی طرف چلی گئی تھی۔

چھٹی تک کا وقت اس نے آفس میں معمول کے انداز میں گزارا تھا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ واپس آئی۔ روز کی طرح وہاں خاموشی، تنہائی، اداسی اور ویرانی نے اس کا استقبال کیا۔ یہ ایک مہینہ اس نے امید و بیم کی کیفیت میں گزارا تھا۔ کسی خطرناک و جان لیوا بیماری میں مبتلا اس مریض کی طرح جو ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنے سب ٹیسٹ کروا آئے اور پھر رپورٹس کا انتظار اس امید پر کرے کہ شاید ان میں سے

کچھ ٹھیک آئے گا۔ اس کے ہاتھ میں بھی آج رپورٹس آ گئی تھیں اور وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ اس کی زندگی میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہونے والا۔ وہ اس کے پاس آنے کے بجائے اس سے اور بھی دور جا رہا تھا۔ اب کچھ تو سوچنا تھا، کوئی فیصلہ تو کرنا تھا۔

"کلثوم! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا کل کسی وقت تم مجھ سے ملنے میرے اپارٹمنٹ آ سکتی ہو؟" بیگ میز پر رکھتے ہی اس نے کلثوم کا فون نمبر ملایا اور بہت ہچکچاتے ہوئے یہ بات اس سے کہی۔ کبھی دوستوں کے خلوص کو آزمایا نہیں تھا اس لیے بری طرح ڈر رہی تھی۔ اس کے لہجے کا غیر معمولی پن کلثوم نے یقیناً فوراً بھانپ لیا تھا، اس لیے کیوں، کس لیے، کس وجہ سے، جیسے کسی سوالوں میں الجھے بغیر اپنے آنے کا وقت اس کے ساتھ فوراً طے کر لیا تھا۔

✿ ✿ ✿

"میں مانی نا میری نصیحت، کہا تھا اس شخص پر یوں اندھا بھروسا مت کرو۔ رہ گئیں نا اکیلی، خالی ہاتھ و تہی دامن۔" کلثوم کو یہ بتانے کے بعد کہ حمیر رضا نے کسی اور سے شادی کر لی ہے، وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ان نگاہوں سے دیکھا جیسے ابھی اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھرے گی اور اس سے یہی کچھ کہے گی مگر کلثوم کے چہرے پر نہ طنز تھا، نہ ملامت۔ اس کے چہرے پر شاک کی کیفیت تھی، حیرت تھی، دکھ تھا، رنج تھا۔ وہ انتہائی دکھ بھری حیرت سے دم سادھے اسے دیکھے چلی گئی۔

"بابا! یہ۔۔۔ یہ کب ہوا؟"

"ایک مہینہ ہو گیا۔" اس نے ندامت سے سر جھکا کر اسے جواب دیا۔ کلثوم اس کے بیڈروم میں اس کے پاس بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ایک مہینہ؟" وہ حیرت سے چلائی۔

"ایک مہینہ؟ اور ایک مہینے سے تم یہاں اکیلی رہ رہی ہو۔ بابا! تم کیا پاگل ہو چکی ہو؟ یہاں لوگ بدشکل اور عمر رسیدہ عورتوں کو نہیں چھوڑتے تو کسی خوب صورت اور تنہا لڑکی کو بخش سکتے ہیں؟ ایک مہینے سے تم یہاں پر تنہا ہو، تم نے اتنا بڑا رسک لیا۔ پاگل لڑکی! اگر کچھ ہو جاتا پھر۔۔۔ پھر۔۔۔"

غصے سے اسے جھڑکتے اس نے یوں جھرجھری لی جیسے ایسی بات صرف سوچنے ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص اتنا گر سکتا ہے۔ تمہاری شادی کے بعد جب بھی تم سے ملتی تھی، مشینی زندگی گزارتے اور تھکن چکر بنا دیکھتی، مجھے بہت برا لگتا مگر تب بھی، تب بھی یہ سوچ تو کبھی میرے دل میں آئی بھی نہیں کہ وہ ذلالت کی ایسی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔ اتنا کم ظرف، اتنا کمینہ۔ تمہاری جیسی اچھی بیوی کی قدر نہیں کی۔ اللہ اس سے ایسا تم پر کیے ہر ظلم کا حساب لے گا کہ وہ سکون کو ترسے گا، چین کی زندگی بھی۔۔۔"

"کلثوم پلیز۔" اسے مزید بددعائیں دینے سے اس نے بے ساختہ روک دیا۔ عجیب سا ڈر لگا تھا، ایک وہمی سی سوچ۔ اگر جو یہ گھڑی قبولیت کی ہوئی پھر؟

"اللہ! وہ ہمیشہ خوش رہے، ہمیشہ سکھی رہے۔ اسے زندگی میں خوشیاں، کامیابیاں، سکون سب کچھ دینا۔" اس نے جیسے کلثوم کی بددعاؤں کا اثر زائل کرنے کے لیے جلدی سے دل میں یہ دعا کی۔

"پھر کیا کہتا ہے اب وہ ذلیل انسان؟ فوراً طلاق دو اس سے۔ تمہارا مہر کتنا ہے اور مہر کے علاوہ تم اس سے بہت سے اخراجات کی مد میں پیسہ نکلوا سکتی ہو۔ جب تک اس کے ساتھ رہیں، تب تک تو اسے اپنی کمائیوں سے خوب مزے کرائے ہیں۔ اب ذرا اس کمینے کو تھوڑا سا سبق بھی تو سکھایا جانا چاہیے۔ ہم کسی اچھے وکیل سے۔۔۔" اس نے کلثوم کی بات کاٹ دی اور اسے یہ بات بتائی کہ حمیر اسے طلاق دینے کے لیے بخوشی آمادہ ہے مگر وہ لینا نہیں چاہتی۔

"بابا! تم۔۔۔ تم۔۔۔" وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سامنے بیٹھی لڑکی اس کی دوست بابا احمد علی نہیں بلکہ اپنا ذہنی توازن مکمل طور پر کھوئی ہوئی ایک پاگل عورت تھی۔

"تم ابھی بھی اس کی منتظر ہو؟ وہ واپس آ جائے گا، اس انتظار میں ہو؟ وہ واپس آئے گا تو تم اسے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائے بغیر فوراً اپنا لو گی۔ تمہارے دل میں ابھی بھی اس شخص کے لیے جگہ ہے جو تمہیں بیچ راستے میں بے یار و مددگار تنہا چھوڑ گیا؟ ارے کچھ عرصہ جانور کو ساتھ رکھیں تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے اور اس نے تو تمہیں جانور جتنی اہمیت بھی نہیں دی۔ تم اس کے لیے، اس کے لیے خود کو برباد کر لو گی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی اور میرا شوہر ایسا کرتا تو میں۔۔۔"

... کی حرام کر دیتیں۔ اسے عدالت کے ... گالیاں دیتیں' بددعائیں دیتیں' اپنا ہر ... والے سے پائی پائی اس سے وصول ...۔" اس نے کلثوم کی بات کاٹی اور اس سے زیادہ ... بولی۔

"تم یہ سب کر سکتی ہو کلثوم! اس لیے کہ تمہاری زندگی میں تمہارے شوہر کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔ تمہارے پاس ایک پورا خاندان ہے جس میں ایک رشتے کی کمی دوسرے رشتے پوری کر سکتے ہیں مگر میرے پاس وہی ایک شخص ہے' میرا شوہر' میرا واحد رشتہ۔ کیا ہوا جو اسے مجھ سے ویسی محبت نہیں جیسی مجھے اس سے ہے۔ محبت کے نہ ہونے سے ہمارا رشتہ ختم تو نہیں ہو گیا۔ جلد یا بدیر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا تو وہ واپس آجائے گا۔"

"وہ واپس آئے گا تو تم صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو بھولا نہیں کہتے کہہ کر اسے پھر سے سر آنکھوں پر بٹھالو گی۔ اس اکیسویں صدی کی ایک مثالی پتی ورتا عورت جو شوہر کی محبت میں خوشی خوشی ستی ہو جائے۔ لعنت ہے ماہا احمد علی تمہارے اس پتی ورتا پن پر۔" کلثوم نے غصے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔

"اور فرض کرو وہ واپس نہیں آیا۔ نہ جلد نہ بدیر' اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہی نہیں پھر؟" کلثوم کا انداز جرح کرنے والا تھا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ واپس آئے گا' وہ واپس آئے گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں بھیگنا شروع ہو گئیں۔

"وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ کہتا ہے "ماہا! تمہاری وجہ سے میری زندگی میں ترتیب ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔" کھوئے کھوئے سے لہجے میں وہ حال کا صیغہ استعمال کر کے یوں بول رہی تھی جیسے وہ دو چار روز کے لیے کہیں چلا گیا تھا اور آج کل میں بس واپس آنے ہی والا تھا۔ اس دیوانی لڑکی کی یہ محبت اور یہ یقین کلثوم کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ اس نے بے اختیار کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"وہ تمہاری محبت کے لائق نہیں ماہا! مت خوار کرو خود کو یوں۔ جو تمہیں بغیر کسی خطا کے بیچ رستے میں چھوڑ گیا' تمہیں بھلا گیا' اسے تم بھی بھول جاؤ۔"

"بھلا دینا اتنا آسان نہیں ہوتا کلثوم! میں نے اس سے محبت کی ہے۔ اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور سچائیوں کے ساتھ۔ تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس روز وہ واپس آئے گا کر "ماہا! میں تمہارے پاس واپس آگیا۔" تو میں واقعی پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی وہیں سے شروع کر دوں گی' جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔" وہ اپنی دوست کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو پڑی تھی اور کلثوم عدنان اس کی پشت پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"ماہا! تم آنٹی کے پاس کیوں نہیں گئیں؟ ایک مہینے سے تنہا رہ رہی ہو' کتنا بڑا خطرہ مول لیا' اکیلی رہتی رہیں۔"

بہت دیر بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو کر پائی تو اس بات کی طرف آگئی جو اس وقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور جس کی وجہ سے اس نے کلثوم کو بلایا تھا جو اسے کبھی اپنی ماں' سوتیلے باپ اور بھائی بہن کے متعلق سچ نہیں بتا پائی تو اس کے متعلق سچ کیونکر بتا دیتی جس سے اسے واقعی محبت تھی اور جسے وہ لوگوں کی نگاہوں سے گرتا ہوا کبھی دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ ممی کے گھر کیوں نہیں گئی' اس بات کو سمجھانے کے لیے وہ بہت پیچھے کی باتوں کی طرف نہیں گئی۔ صرف حال کا ایک وہ تازہ واقعہ سنا دیا جو محض آٹھ روز پہلے پیش آیا تھا۔ ہفتے کی رات ممی' عبداللہ کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آگئی تھیں۔ وہ اسے عبداللہ کی جاب کی یاد دہانی کروانے' اس کا سی وی اور ڈاکیومنٹس دینے آئی تھیں اور وہ غیر متوقع طور پر انہیں دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے حمیر کی غیر موجودگی اور اپارٹمنٹ میں اپنے تنہا ہونے کا جواز پیش کرنے کے لیے کسی جھوٹ کے بجائے بوکھلاہٹ میں اسے انہیں سچ بتانا پڑا تھا اور سچ سنتے ہی وہ گھبرا کر یوں کھڑی ہو گئی تھیں جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ "ماہا کہیں واپس ان کے گھر نہ آجائے۔" اس نے ان کی آنکھوں میں پھیلے اس خوف کو بڑے آرام سے دیکھ لیا تھا۔ تب اس نے خود نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر کہیں اور جائے گی مگر آج حمیر کی فون کال کے بعد اسے پتا چل گیا تھا کہ اب اسے یہاں سے جانا ہے۔ وہ صحیح کہتا تھا' اس کی ممی اتنی ظالم نہیں جتنا وہ انہیں سمجھتی تھی۔ بس اتنا ہی تو تھا کہ ان کے گھر میں اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ اس میں ظلم تو کہیں بھی نہیں تھا۔

کلثوم کی آنکھوں میں ایک بار پھر اس کے لیے حیرت ا...

"تو تم اس کی زندگی حرام کر دیتیں۔ اسے عدالت کے کٹہرے میں گھسیٹتیں، گالیاں دیتیں، بددعائیں دیتیں، اپنا ہر حق پیسے کے حوالے سے پائی پائی اس سے وصول کرتیں۔" "اس نے کلثوم کی بات کاٹی اور اس سے زیادہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔" وہ سارے تمہارے تھے کیونکہ اس لیے کہ تمہاری زندگی تھا۔

✡ ✡ ✡

پاگل آنکھوں والی لڑکی!
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو
پچھتاؤ گی!
سوچ کا سارا ابریشم
مٹی کی راکھ میں گھل جائے گا
کچے پکے رشتوں کی خوشبو کا ریشم
کھل جائے گا!

تم کیا جانو؟
خواب سفر کی دھوپ کے تیشے
خواب ادھوری رات کا دوزخ
خواب خیالوں کا پچھتاوا
خوابوں کی منزل رسوائی!
خوابوں کا حاصل تنہائی!!
تم کیا جانو؟
مہنگے خواب خریدنا ہوں تو
آنکھیں بیچنا پڑتی ہیں یا
رشتے بھولنا پڑتے ہیں
اندیشوں کی ریت نہ پھانکو
پیاس کی اوٹ سراب نہ دیکھو
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو!!
تھک جاؤ گی!!

بہت مہنگے خواب دیکھ بیٹھی تھی ماہا احمد علی۔ آج اس کے وہ سارے خواب ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

"دیکھیں، اس باکس میں بہت قیمتی ہینگنگز اور کرسٹل کے گلدان رکھے ہیں، اسے احتیاط سے رکھیے گا۔"

"اس باکس میں بہت نازک کراکری ہے، دیکھیے گا کہیں ٹوٹ نہ جائے۔" وہ اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو بار بار پیچھے دھکیل کر سامان اٹھاتے ہوئے مزدوروں کو

محبت کی ہے۔ اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور سچائی کے ساتھ۔ تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! میں ایک دن واپس آئے گا کر" "ماہا میں تمہارے پاس واپس آؤں گا" واقعی پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی پھر سے شروع کروں گی، جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔" بہت دوست کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو پڑی تھی ماہا۔

اس نے کلثوم کے پیش کردہ اس ادلے ہولے ہاتھ سے ہو کر یہ بات سنی ہوئی تھی کہ ان کی ضرورت کے حساب سے گراؤنڈ فلور ہی بہت ہے۔ فرسٹ فلور پر بنا ایک کمرہ اٹیچڈ باتھ اور ایک کچن ان کی ضرورت سے زائد ہے۔ خالی پڑے اس کمرے کو اگر وہ کرایہ پر دے دیں تو بجائے استعمال ہی ہونے کے اور کچھ پیسے بھی مل جائیں گے۔ ان کے گھر چونکہ گیٹ ایک ہی تھا اور فرسٹ فلور پر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی گھر کے اندرونی حصے سے ہی جاتی تھیں، اس لیے وہ کسی قریبی جان پہچان والی چھوٹی سی فیملی کو وہ کمرہ کرایہ پر دینا چاہتے تھے۔

اس نے اس روز کلثوم سے وہ کمرہ کرایہ پر لینے کی بات کی تھی۔ وہ کتنے کرایہ پر کمرہ دینا چاہتے تھے، یہ اس کے علم میں تھا۔ کلثوم کو سب کچھ سچ بتا دینے کے بعد اس نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ یہ ساری سچائی کسی اور کو نہیں بتائے گی۔ اپنے شوہر کو بھی نہیں، اپنے والدین کو بھی نہیں۔

پھر ایک جھوٹی کہانی ماہا احمد علی کے پاس تیار تھی۔ اس کا شوہر مزید تعلیم حاصل کرنے امریکہ گیا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے گھر میں وہ اکیلی تو نہیں رہ سکتی اور چونکہ اس کا شوہر خوددار اور غیرت مند بہت ہے، اسی لیے اسے اتنے لمبے عرصے تک اپنی بیوی کا اس کے میکے میں رہنا کسی صورت گوارا نہیں۔ سوا اسی خودداری اور غیرت مندی کے سبب وہ ان کے گھر بطور کرایہ دار رہنا چاہتی ہے۔ یوں اس کے شوہر کی خودداری پر کوئی آنچ بھی نہیں آئے گی اور وہ کسی انجان جگہ اور تنہا رہنے جیسی مشکلات کا شکار بھی نہیں ہو گی۔ کلثوم کی فیملی اس کی دیکھی بھالی ہے اور اس کے شوہر کو بھی ان پر پورا بھروسا ہے۔

اپارٹمنٹ سے سامان شفٹ ہوتے وقت کلثوم اس کے ساتھ سارا وقت رہنا چاہتی تھی۔ اپنا محبتوں سے بسایا گھر اجڑتا، بکھرتا اور خالی ہوتا دیکھنا کسی عورت کے لیے سہل نہیں ہوتا مگر گھر، شوہر، بچے وہ انہیں نظرانداز کر کے پورا دن اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ ماہا نے اسے خود

ہی جانے کے لیے کہا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ گھر خالی ہوتا چلا گیا جس میں دو سال اور نو مہینے پہلے اس نے تیمور رضا کے ساتھ ایک نئی زندگی کی ابتدا کرتے ہوئے قدم رکھا تھا۔ یہاں قدم قدم پر اس کے خواب بکھرے ہوئے تھے۔ آج اس کے خواب اس سے چھن رہے تھے۔ آج اس کا گھر اس سے چھن رہا تھا۔ وہ یادیں اور وہ سارے خواب، سب رزقِ خاک ہوئے جا رہے تھے۔ وہ خالی اپارٹمنٹ میں اکیلی کھڑی تھی۔ اس کی زندگی کا وہ جو تھا گھر اس سے چھن گیا تھا جسے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس نے اپنا مان لیا تھا اور اپنے لیے بنانے کے بعد اسے بہت پیار سے، دن رات محنت کر کے سجایا تھا۔ ایک گھر، ایک دریچہ، ایک پیار بھری چھاؤں، ان سب کے خواب دیکھتی ماہا احمد علی ایک بار پھر بے گھر ہو گئی

✡ ✡ ✡

ہم اکیلے ہیں، چاہے اس اکیلے پن میں ہمارا اپنا کوئی قصور نہیں پھر بھی، معاشرے کے مروجہ اصولوں کے تحت لوگوں کی نگاہوں میں اپنی عزت اور اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے ہمیں اپنا اکیلا پن چھپانا پڑتا ہے۔ وہ بھی لوگوں سے اپنے اکیلے پن کو چھپائے زندگی کو جینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ممی کے گھر واپس نہیں گئی اور اپنا رہنے کا کہیں اور انتظام کر لیا تو انہوں نے بھی اس سے کنی کترانا اور نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ وگرنہ اس سے پہلے عبداللہ کی جاب کے سلسلے میں اس سے کچھ پوچھنے کے لیے اس نے وہاں صرف فون کیا تو وہ اس کی آواز سنتے ہی پریشان ہو جاتی تھیں۔ وہ اسے گھر واپس نہیں بلانے والی اور یہ کہ اس نے عبداللہ کو کمپنی میں جاب بھی دلوا دی ہے، ان دونوں باتوں کے سبب ممی اور انکل تک اس سے کافی بہتر انداز میں بات کرنے لگے تھے۔ عبداللہ کی جاب کا ہو جانے کے بعد جب ممی، عبداللہ اور اس کا شوہر مٹھائی اور کچھ قیمتی تحائف لے کر اس سے ملنے گھر پر آئے تو کلثوم کے گھر والوں کی نگاہوں میں اپنی عزت اور بھرم قائم رہنے کے احساس نے اسے بے حد اطمینان دلایا۔

عبداللہ چونکہ اس کے انڈر میں کام کر رہا تھا، اس لیے ہمیشہ اس کے ساتھ بہت اچھا رویہ اختیار رکھنے لگا تھا۔ گاہے بگاہے فوقتاً وہ اس سے ملنے آ جاتا۔ اسے کہیں جانا ہوتا تو ساتھ لے جانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتا اور وہ قصداً اسے انکار نہ کرتی۔ لوگوں کو جو نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں۔ صبح سے شام تک آفس اور آفس کے بعد وہ ایک کمرہ۔ اس کی زندگی ان دنوں اس طور گزر رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

کلثوم کی چھوٹی بہن غزل کی شادی کا سلسلہ تھا۔ آفس کی مصروفیات سے علاوہ اس کے پاس جب بھی وقت ہوتا وہ شادی کی تیاریوں میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتی۔ ان آٹھ مہینوں میں آنٹی اور انکل نے اسے گھر کا فرد ہی سمجھا تھا۔

خلوص اور محبت اکثر وہاں سے نہیں ملتا جہاں سے ہمیں امید ہوتی ہے اور جہاں سے کبھی امید رکھی ہی نہ ہو۔ کبھی کبھی وہاں سے مل کر انسان کو جینے کی نئی آس دینے لگتا ہے۔ فائز کی یہ سگی پھوپھو کا گھر تھا، سو وہ اکثر یہاں آ جاتا تھا اور ان دنوں چونکہ شادی کی تیاریوں کا مرحلہ درپیش تھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ یہاں آ رہا تھا۔ آفس میں اب اس سے ملنا اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ اپنے پاپا کی ناراضیوں اور خفگیوں پر کان دھرتے بالآخر اس نے ان کی کمپنی جوائن کر لی تھی۔ فائز کی یہ بات اسے اچھی لگتی تھی کہ ایک امیر اور باثر و بااختیار شخص کا بیٹا ہونے کے باوجود اس میں اپنی امارت پر غرور کے بجائے سادگی تھی۔

یونیورسٹی میں جب کلثوم کے حوالے سے وہ شروع شروع میں اس سے ملی تو اس کی کسی بات سے اسے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ ایک بزنس ٹائیکون کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا ہے۔ تب کلثوم ہی نے ایک بار فائز کے پاپا کی کمپنی اور ان کے اسٹیٹس کے متعلق بتا کر اسے حیران کر دیا تھا اور تب اس نے یہ سمجھا تھا کہ وہ اپر کلاس سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا انسان ہے جسے اپنی دولت، اپنی حیثیت اور اپنے مقام پر قطعاً کوئی غرور یا اکڑ نہیں۔ کلثوم کا گھرانہ ایک کھاتا پیتا خوشحال گھرانہ کہلایا جا سکتا تھا مگر پھر بھی ان کے اور فائز کے گھرانے کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسٹیٹس کے اس فرق کے باوجود بھی وہ اپنی پھوپھو کے گھر خوب آتا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کے ممی پاپا اور چھوٹی بہن آمنہ بھی آنٹی، انکل کے ہاں ہر خوشی کے موقع پر پوری خوشی کے ساتھ شرکت کے لیے موجود ہوا کرتے۔

اس روز بھی ایسا ہی ایک دن تھا جب شام کے وقت فائز ان لوگوں کو شاپنگ کرانے لے کر آیا ہوا تھا۔ غزل کو ماہا کی پسند پر بہت بھروسا تھا' اس لیے وہ اپنی زیادہ تر شاپنگ اسی کے مشورے سے کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ بھابھی بھی ان لوگوں کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ لوگ خریداری کر رہی تھیں اور فائز گاڑی میں بیٹھ کر اونگھتا ان کی شاپنگ ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ شاپنگ ان کی تقریباً ساری ہو چکی تھی۔

"آپ لوگ جا کر دکان سے کپڑے لے آئیں' مجھے ذرا یہاں ایک شاپ پر کچھ کام ہے۔ آپ لوگ فارغ ہو کر گاڑی کے پاس چلے جائیے گا' میں بھی وہیں آجاؤں گی۔" اس نے ان دونوں سے کہا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں آگے بڑھیں' وہ بچوں کی اس دکان میں آگئی جہاں نیو بارن بے بیز کے کپڑوں سے لے کر دیگر تمام سامان تک کی وسیع اور اسپریڈ رینج موجود تھی۔ وہ بھابھی کو ان کے پہلے بچے کی پیدائش پر کچھ اچھا سا تحفہ دینا چاہ رہی تھی۔ اس طرح کی دکانوں کو دیکھ کر جس طرح کی حسرت اور ادھورا پن اس کے اندر ہمیشہ پھیل جایا کرتا تھا۔ آج بھی پھیل گیا تھا۔ کاش... کاش وہ بھی... شیشے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور ہمیشہ کی طرح اپنے اندر حسرتیں اور اداسیاں پھیلتی دیکھیں۔ سامنے وہ جو بہت چھوٹا سا پنک فراک ہینگر میں لٹک رہا تھا اور اس کے ساتھ جو پنک ہیٹ اور چھوٹے چھوٹے سے پنک جوتے بھی نظر آرہے تھے' وہ انہیں دیکھ کر رک گئی اور ادھر جو کاؤنٹر کے سامنے کھڑی لڑکی جو شاید اپنے شوہر کے ساتھ تھی جس طرح مدر کیئر اور دیگر مختلف برانڈز کی چیزیں دیکھ دیکھ کر ریجیکٹ کیے جا رہی تھی' اپنے ہونے والے بچے کے لیے اچھی سے اچھی چیز خریدنے کی چاہ میں۔ شاید وہ بھی ایسا ہی کرتی' نجانے کتنی بار اس نے بڑی امیدوں کے ساتھ وہ منظر تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا جب وہ ماں بننے والی ہوگی۔ جب وہ اپنے ہونے والے بچے کی حمیر کے ساتھ مل کر شاپنگ کرے گی۔ اسے بچوں کی کتنی خواہش ہے یہ بات حمیر اچھی طرح جانتا تھا۔

"ہم اپنی بیٹی کا نام ایل رکھیں گے۔" ایک بار باتوں کے دوران اس نے حمیر سے کہا تھا۔

"نہیں بھئی' بیٹی مجھے نہیں چاہیے۔ پال پوس کر بڑا کرو' پڑھاؤ' لکھاؤ اور پھر کسی اور کو دے دو۔ مجھے بیٹا چاہیے اور اپنے بیٹے کا نام ہم روحان رکھیں گے۔" اس

کے کانوں میں اس رات کی ان دونوں کی وہ آوازیں ابھی گونج رہی تھیں جیسے کل رات ہی انہوں نے یہ باتیں کی ہوں اور پھر بے ساختہ ہی پنک فراک کو اس کی تمام تر خوبصورتی کے باوجود اس نے نظرانداز کیا اور Baby Girls والے سیکشن سے Baby Boys والے حصے کی طرف آئی۔

"حمیر' یہ بلینکٹ دیکھو' کیسا لگ رہا ہے؟" وہ آواز پر نہیں اس نام پر چونکی تھی۔ دنیا میں حمیر نام کے لاکھوں لوگ ہوں گے پھر بھی یہ نام ہر بار دل کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیا کرتا تھا' وہ بے ساختہ پوری کی پوری گھوم گئی اس آواز اور اس کے مخاطب دونوں کو دیکھنے اور اسے جو نظر آیا' اس کی وہ ہرگز ہرگز توقع نہیں رکھتی تھی۔ وہ دونوں اس سے چند قدم کی دوری پر کاؤنٹر کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دونوں اس کے بالکل سامنے تھے مگر خریداری اور گفتگو میں اتنے مشغول کہ انہیں سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

اسے کھڑے ہو کر کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں تھی' اس نے جن مہینوں کے لاتعداد دنوں اور راتوں کو کانٹوں پر گزارا تھا' وہ ان کی تعداد بغیر گنے بتا سکتی تھی۔ وہ بتا سکتی تھی کہ اس لڑکی سے اس کے شوہر کی شادی کو آٹھ مہینے اور ستائیس دن ہو چکے ہیں اور وہ کتنے مہینوں کی پریگننٹ تھی' یہ اس کی حالت دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا۔ دو سال اور سات مہینوں تک جس دن کے انتظار میں وہ پل پل تڑپی' اس دن کا اس دوسری لڑکی کو چند مہینے بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ تھا ماہا احمد علی اور سدرہ آفاق کی اوقات میں فرق۔ اس شخص کی نگاہوں میں ان کے مقام اور ان کی حیثیت کا فرق۔ اس شخص کی نظروں میں اس کی کیا وقعت ہے' یہ جاننے میں اتنی دیر لگا دی؟ اسے اس کے پاس کبھی واپس نہیں آنا' یہ جاننے میں اتنی دیر لگ گئی؟

"وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ میرے بغیر تو اس کی صبح نہیں ہو سکتی۔" اس کے بغیر اس کی صبح' دوپہر' شام اور رات سب ہو رہی تھیں اور بہت خوب ہو رہی تھیں۔ اسے اپنی زندگی سے نکال کر وہ بہت خوش' بہت مطمئن اور بہت آسودہ تھا۔ اس کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آرہی تھیں۔ وہ باپ بننے والا تھا اور اس کے بچے کی ماں ماہا احمد علی نہیں' دوسری عورت تھی۔

اسے ماں بننے کے حق سے محروم رکھ کر جس نے ا...

...ہر رکھنے کا کسی کو بھی کوئی حق نہیں تھا' وہی حق ایک دوسری عورت کو اتنی آسانی سے دے دیا۔

وہ خود کو اس کی شریک حیات کہتی تھی۔ غلط' بالکل غلط۔ وہ فقط اس کی شریک اپارٹمنٹ تھی۔ جیسی زندگی وہ چاہتا تھا' اسے گزارنے میں اس کی مددگار و معاون۔ اپنا کھاؤ اپنا کماؤ۔ ہاں واقعی وہ امریکن اسٹائل ہی کی تو ملکہ تھی۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں' اپارٹمنٹ کا کرایہ اور بل میں پے کروں گا تو باقی کھانا پینا' رہنا سہنا' گھر کی زیبائش و آرائش اور دیگر تمام اخراجات تمہارے ذمے۔ تب ہی جب وہ اپنی چیزوں کے ساتھ اس کی شیونگ کا سامان اور دوسری چیزیں لے آتی وہ بھولے سے اس کا شکریہ ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کا احسان مند کیوں ہوتا' وہ اس کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس کا فون' بجلی اور گیس استعمال کرتی تھی جس کا بل وہ ادا کرتا تھا۔

ڈاکٹر اعجاز ارشد کے آفس میں ملی اس لڑکی سے اس کے دل نے نہیں' دماغ نے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک ذہین اور قابل لڑکی جو عنقریب ایم بی اے کرلینے والی تھی اور جو اپنے لباس اور اپنے ہر انداز سے کسی ہائی کلاس گھرانے کی لڑکی نظر آرہی تھی۔ اپنی اعلا تعلیم اور فارن بینک میں ملازمت کے باوجود اس کے پاس کوئی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ نہیں تھا اور اس کمزور فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ اونچے طبقے کی کوئی لڑکی اسے ملنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ تب یہ نہیں معلوم تھا کہ کسی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ کے بغیر بھی ایک روز اسے سدرہ آفاق جیسی بڑے گھر کی بیٹی مل سکتی ہے۔ تب کے حالات کے لحاظ سے ماہا احمد علی ایک بہترین چوائس تھی۔ جیسا لائف اسٹائل اسے پسند تھا' فارن بینک میں جاب اور بہت اچھی سیلری کے باوجود وہ تن تنہا اسے افورڈ نہیں کرسکتا۔

کیا قسمت تھی اس شخص کی۔ وہ لوگوں کو چیزوں کی طرح استعمال کرتا تھا' ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی حوالے سے اس سے محبت کرتے تھے۔ اس سے بہت پیار کرنے والا اس کا بڑا بھائی جیسے غلام عباس' اس کا بہت پرانا اور بہت مخلص دوست۔ جب تک بھائی کی ضرورت رہی' اسے استعمال کرتا رہا۔ جب تک دوست کی ضرورت رہی' اسے استعمال کرتا رہا اور جب ضرورت پوری ہو گئی تو اپنی زندگی سے نکال کر باہر پھینک دیا اور بالکل اسی طرح ماہا احمد علی کے ساتھ ہوا تھا۔

سدرہ آفاق مل گئی تو اسے بالکل اسی طرح دھتکار دیا گیا جیسے اپنے بھائی اور دوست کو دھتکارا تھا اور جیسے نجانے کتنے اور سادہ لوگوں کو دھتکارا ہوگا۔ دو سال اور سات مہینوں کے ساتھ میں اس نے ایک دن بھی ماہا احمد علی کو خود پر بوجھ نہیں بننے دیا۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ اور گیس' بجلی' فون کے بل پے کرنے کے علاوہ اس کی باقی ساری کمائی کہاں جاتی ہے' ماہا کو کبھی یہ نہیں بتایا گیا۔

قسمت ہے تو اس شخص کی کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے لوگوں کو استعمال کر رہا ہوتا ہے اور وہ خوشی خوشی خود کو استعمال کروانے کے ساتھ اس سے محبت بھی کیے جاتے ہیں۔

"وہ واپس آئے گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنی خوش فہمیوں پہ ہنسے یا روئے۔ اتنا یقین اس شخص کے بارے میں جسے نہ اس سے محبت تھی' نہ انسیت۔ یہاں تک کہ ہمدردی بھی نہیں۔ اس کی محبت بے اثر بھی تھی' بے تاثیر بھی۔ بے فیض بھی اور لاحاصل بھی۔ وہ ایک پتھر کی محبت میں مبتلا تھی جس میں دل اور جذبات نام کی کوئی چیزیں موجود ہی نہیں تھیں۔

اسے حمیر رضا سے زیادہ خود اپنے آپ سے نفرت ہوئی۔ وہ اس شخص کی محبت میں پاگل' دیوانی اور اندھی ہو چکی تھی۔ اس شخص کی جو انسانیت کی سطح سے اتنا نیچے گرا ہوا ہے' جو اتنا خود غرض اور اس حد تک کمینہ ہے' اس کی؟

"کلثوم! تم جس شخص کو برا کہتی ہو' وہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ پست' گھٹیا اور رذیل ہے۔" اس نے دیکھا وہ اپنا والٹ نکال کر اس میں سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ ادھر ادھر نکال کر اس لمبی چوڑی خریداری کے بل کی پے منٹ کر رہا تھا جو بڑے باپ کی اس بیٹی کو اس نے کروائی تھی۔ یہ حمیر رضا کی ایک انویسٹمنٹ ہی تو تھی۔

سیلزمین سے کچھ بات کرتے کرتے سدرہ آفاق کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے شوہر سے آہستہ آواز میں کچھ بولی۔ شاید یہ کہ "وہ دیکھو سامنے کھڑی لڑکی کتنے غور غور سے آنکھیں پھاڑ کر ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔" سدرہ کی بات پر دھیان دیتے حمیر نے والٹ جیب میں واپس رکھتے ہوئے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور ماہا نے دیکھا کہ وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا ہے۔ کچھ الجھن' کچھ ناگواری' کچھ بیزاری یہ

تمام تاثرات بیک وقت اس کے چہرے پر پھیلے تھے۔ اسے یقیناً اس سے یہ خطرہ لاحق ہوا تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق رونا دھونا مچا کر پھر اس کے پیروں میں گرنے کی کوشش کرے گی۔

"حوی! تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ پلیز واپس آجاؤ۔" جیسی کچھ التجائیں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کرے گی۔

حمیر رضا کی آنکھوں میں "کہیں کوئی تماشا نہ ہو جائے" کا خوف دیکھ کر اس کا واقعی جی چاہا کہ وہ یہاں اسی دکان میں ایک سین کری ایٹ کرے مگر کیا کرتی کہ ماہا احمد علی تماشے کر لینے والی لڑکی تھی نہیں۔ اگر واقعی ایسی ہوتی تو اس کے منہ پر کھینچ کر دو تین طمانچے مارتی جس نے اس کی محبت' اس کے خلوص' اس کی سادگی اور اس کی وفاؤں کا مذاق اڑایا۔ کاش وہ کوئی تماشا کر پاتی۔

"تم یہاں کھڑی ہو؟ اور وہاں بھابھی اور غزل مجھ سے آکر پوچھ رہی ہیں کہ ماہا کہاں ہے۔" اس نے اپنے پیچھے فائز کی آواز سنی۔ وہ اسے دیکھ کر دور سے ہی بولتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔ اپنے چہرے کے تاثرات کو ہر ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کرتے وہ اس کی طرف مڑی۔

"میں بس یہاں سے نکل ہی رہی تھی۔ چلو۔" فائز نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے کھڑے اس خوب صورت سے جوڑے پر تھیں جو خوشی سے سرشار اپنے پہلے پہلے بچے کی شاپنگ کر کے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے۔

"ہائے فائز!" سدرہ آفاق نے وہیں سے مسکرا کر فائز کو ہیلو کہا تو وہ فوراً" ہی چند قدموں کا فاصلہ عبور کر کے ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو سدرہ! کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔" پھر اسے حمیر سے ملوانے لگی۔

"میرے ہسبینڈ حمیر رضا۔"

"تمہیں تعارف کروانے کی ضرورت نہیں' میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" فائز کے مسکراتے اور خوش اخلاقی سے بھرپور لہجے میں چھپی طنزیہ کاٹ اتنی واضح تھی کہ سدرہ آفاق نے چونک کر اسے دیکھا جبکہ حمیر نے جز بز ہوتے اپنی ناگواری کو بمشکل خوش اخلاقی کے پردے میں چھپایا۔ وہ فائز کو ماہا کے دوست کی حیثیت سے شاید ہی پہچانتا ہو کہ دوستی کے معاملے میں اسے ماہا کے معیار شدید اختلاف رہا کرتا تھا۔ وہ اسٹیٹس دیکھے بغیر ا پونجیوں کو دوست بنا لیتی تھی۔

تب وہ اس بات کو سمجھتی نہیں تھی۔ اگر سمجھتی تو رضا کو فائز کے ذکر کے دوران یہ ضرور بتاتی کہ فائز عبید ا بزنس ٹائیکون کا اکلوتا بیٹا ہے پھر وہ اس کے دوست یقیناً فوراً" ملنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس وقت اسے ماہا ساتھ دیکھ کر ظاہر ہے۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کا کوئی قریبی دوست ہے۔

"میرا مطلب ہے' تمہاری شادی پر میں حمیر صاحب سے مل چکا ہوں۔" فائز نے مسکراتے ہوئے اپنے غلط فہمی وضاحت کی۔ وہ ابھی بھی طنزیہ لگاہوں ہی سے مسکراتے ہوئے حمیر کو دیکھ رہا تھا۔

"ارے میں نے آپ دونوں کو اپنی دوست ماہا حمیر رضا سے تو ملوایا نہیں۔" اس نے ماہا حمیر رضا کہتے ہوئے ایک لفظ بہت چبا چبا کر ادا کیا۔

"بہت چڑتی ہے۔ اگر کبھی اسے اس کے شادی سے پہلے والے نام ماہا احمد علی سے بلاؤں۔" وہ حمیر کی ناگواری اور کوفت اور سدرہ کی حیرت و اچنبھے کو انجوائے کرتے ہوئے مسکرایا اور پھر گردن گھما کر وہاں دیکھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے بھی وہیں دیکھا تھا۔ وہ جگہ خالی تھی۔ ان کی باہم گفتگو کے دوران ہی وہ وہاں سے نکل کر جا چکی تھی۔

"او ماہا تو چلی بھی گئی۔ چلو خیر' کوئی بات نہیں پھر کبھی آپ دونوں کو اس سے ملواؤں گا۔ بہت اچھی لڑکی ہے بس ایک ہی خرابی ہے اس میں۔ اسے لوگوں کی پہچان نہیں ہے سب کو اپنے جیسا سچا اور مخلص سمجھتی ہے۔" حمیر کے چہرے سے اب رسمی سی مسکراہٹ بھی مکمل طور پر رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب واضح برہمی اور غصے سے فائز کو دیکھ رہا تھا۔

جبکہ سدرہ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد اس گزشتہ صورت حال کو اپنے قابو میں کرنے اور فائز عبید کی مسلسل چلتی منہ پھٹ زبان کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر فائز عبید اس کی کوششوں سے نہیں' اپنی مرضی سے خاموش ہوا تھا۔ اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا' اسی لیے سدرہ سے خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے حمیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''امید ہے آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہوئی ہو گی۔'' حمیر نے بحالت مجبوری اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو وہاں ماما' بھابھی اور غزل کے ساتھ ہنسنے اور باتیں کرنے میں معروف تھی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کن لوگوں سے ملی ہے' اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اپنی دوست کے اس دکھ پر بے انتہا دکھ محسوس کرنے کے باوجود اسے اس پر نئے سرے سے شدید غصہ آیا۔ وہ دوستوں کے خلوص کو پہچانتی ہے' اسے جانتی اور مانتی بھی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے دکھ کسی اور سے تو کیا دوستوں سے بھی شیئر کرنا گوارا نہیں کرتی۔

''فائز تم۔'' گھر پہنچنے کے بعد وہ قصداً گاڑی سے سب سے آخر میں اتری اور جیسے ہی غزل اور بھابھی گیٹ میں گھسیں' اس نے فائز کو مخاطب کیا۔

''بے فکر رہو' میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔'' فائز نے جتا دینے والے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں' میں یہ نہیں کہہ رہی۔''

''پھر یہ پوچھنا چاہتی ہو گی کہ مجھے یہ سب کب سے معلوم ہے اور میں سدرہ کو کیسے جانتا ہوں۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ میں نے اور اس نے امریکہ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے' اس کی ممی کی میری مما کے ساتھ دوستی ہے اور یہ کہ میں نے اس کی شادی میں شرکت بھی کی تھی اور دولہا کی حیثیت سے میر رضا کو دیکھ کر میں ساکت رہ گیا تھا۔ تب تمہاری آفس سے غیر حاضری کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں اسی رات کلثوم کے گھر گیا' یہ سوچ کر کہ شاید وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہوگی مگر اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا پھر میں نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا اور خاموشی سے وہاں سے آگیا۔ تم نے نہ کلثوم کو بھروسے کے قابل سمجھا نہ مجھے۔ تم آفس سے طویل چھٹی لے کر گھر پر بند تھیں' میرا کتنی بار دل چاہا کہ میں کلثوم کو ساتھ لے کر تمہارے پاس آؤں۔ ہم دونوں مل کر تمہارا دکھ شیئر کریں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں تو یہی لگتا کہ تمہارے دوست تمہارا غم بانٹنے نہیں بلکہ مزا لینے آئے ہیں۔ جب تم ایسا سمجھتی تھیں تو بس میں خاموش ہو گیا۔ حالانکہ کتنی بار میرا دل چاہا کہ تم سے کہوں' ایک بار اپنے دوستوں کے پاس بیٹھ کر آنسو بہالو اور خبردار پھر کبھی مت رونا۔ اس شخص کے لیے ہرگز نہیں۔'' وہ شخص تو نہیں

ہاں اپنے دوست کا خلوص ضرور اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔

''فائز' آئی ایم سوری اگر میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔ مجھے تم پر اور کلثوم پر' اپنے دوستوں پر پورا بھروسا ہے اور میں یہ بات بہت اچھی طرح جان گئی ہوں کہ اگر خونی و شرعی رشتوں کے حوالے سے میں محروم رکھی گئی ہوں تو مجھے اتنے مخلص دوست دے کر کاتب تقدیر نے ان ساری محرومیوں کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔'' اس پل اس نے فائز سے اپنے آنسو نہیں چھپائے تھے۔

✡ ✡ ✡

پھر اس رات جب وہ سونے لیٹی تو ہر رات کی طرح اپنے قریب ایک وجود کی کمی محسوس نہیں کی' اپنے گرد ان بانہوں کا سہارا نہیں تلاشا۔ نہ ہر رات کی طرح کروٹیں بدل بدل کر خود ہی روئی اور خود ہی خاموش ہوئی نہ اس کی تصویر کو اپنے پہلو میں رکھا نہ اس سے باتیں کیں نہ یہ کہا کہ جب مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی تو تمہیں میرے بغیر کیسے آتی ہو گی؟ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں مگر اس شخص کی محبت میں نہیں' اپنی تذلیل' اپنی ذلت اور اپنی بے عزتی کے احساس پر' اپنے جذبوں کے بے توقیر ہونے پر نو مہینے جس انتظار میں اس نے پل پل جیتے اور مرتے گزارے وہ انتظار آج سے ختم ہوا۔ اس نے اس کی وہ تصویر جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی پرزے پرزے کر ڈالی۔

''جیسے تم نے مجھے اپنی زندگی سے کٹ کیا' ایسے ہی آج میں بھی تمہیں کر رہی ہوں۔ آج سے تم میرے لیے مر چکے میر رضا! میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت اور میری یہ نفرت مرتے دم تک قائم رہے گی۔ میں تمہیں کوئی بددعا نہیں دے رہی' ہاں مگر میں تمہیں کبھی معاف بھی نہیں کروں گی۔ قیامت تک نہیں' روز حشر تک نہیں۔''

وہی ماما' احمد علی تھیں' وہی اس کی زندگی' وہی اس کے روز و شب' وہی اس کا آفس اور وہی اس کا ایک کمرے پر مشتمل گھر اور تنہا زندگی۔ فرق تھا تو یہ کہ اب اسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔ اب اس کی کوئی صبح اس سوچ سے شروع نہیں ہوتی تھی کہ شاید آج وہ واپس آجائے اور نہ کوئی رات یہ سوچتے کہ کیا پتا آنے والی اگلی شب وہ اس کے پاس ہو۔

زندگی کے دن' رات اور اس کے معمولات سب ویسے ہی تھے تبدیلی صرف اس کی سوچوں میں آئی تھی۔ اب وہ اپنے اندر مر جانے والی زندگی کو پھر سے زندہ کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ وہ زندگی کو جینا چاہتی تھی' وہ اپنی جاب میں اتنی بے تحاشا محنت کرنے لگی تھی کہ اس کے کولیگز اس کے نہ تھکنے پر حیران رہ جایا کرتے تھے۔ اپنی پروفیشنل قابلیت میں اضافے کے لیے وہ شہر کے بہترین انسٹی ٹیوٹس کے ایوننگ پروگرامز میں انٹرنیشنل بزنس ایڈمنسٹریشن' فنانشل پروگرامنگ اینڈ پالیسیز' ہیومن ریسورس مینجمنٹ وغیرہ سے متعلق اسپیشلائزڈ اور پروفیشنل کورسز کیے جا رہی تھی۔ وہ کورسز جہاں اس کی قابلیت کو بڑھا رہے تھے' وہیں اس کا اعتماد بحال کرنے کا کام بھی کر رہے تھے اور اسے رات گئے تک خود کو مصروف رکھنے کا موقع بھی فراہم کر رہے تھے۔ اب شام میں آفس سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ فارغ نہیں ہوتی تھی۔ اپنے کورسز اٹینڈ کرنے جا رہی ہے' لائبریری میں بیٹھ کر پڑھ رہی ہے اور رات میں اپنے کمرے میں بہت دیر تک جاگ کر کتابوں اور انٹرنیٹ کا سہارا لے کر وہ سب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جو لیکچر کے دوران سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اب وہ پہلے کی طرح اندھا دھند پیسے نہیں خرچ کرتی تھی۔ بلکہ بہت سوچ سمجھ کر باقاعدہ پلاننگ کر کے اپنی تنخواہ خرچ کرتی۔ ایک بار ٹھوکر کھائی تھی' ایک بار غلطی کی تھی' بار بار تو اسے نہیں دہرا سکتی تھی۔ اب اس کے دو مختلف بینکس میں الگ الگ اکاؤنٹس تھے۔ اپنی بہت شاندار سی سیلری کا وہ صرف اتنا حصہ استعمال کرتی جتنا اسے اپنے پروفیشنل کورسز کرنے اور ان کورسز سے متعلق مہنگی کتابیں خریدنے کے لیے درکار ہوتا۔ ہاں ایک اضافی خرچا اس نے کمپیوٹر خریدنے کا ضرور کیا تھا کہ وہ گھر پر پڑھنے اور کام کرنے کے لیے اسے لازمی چاہیے تھا۔

اس کے پچھلے پروموشن کو دو سال ہی ہوئے تھے اور وہ دوبارہ ترقی پا گئی تھی۔ اس کی محنت' اس کی لگن اور پروفیشنل قابلیت میں ہوتا مسلسل اضافہ' یہ سب اس کی سفارشیں تھیں۔ وہ میرٹ پر منتخب ہوئی ہے' یہ احساس اس کی کھوئی خود اعتمادی کو واپس لا رہا تھا۔ اگر کسی ایک انسان نے اسے رد کر دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل بے کار' غیر اہم اور بے قیمت ہو گئی ہے۔ وہ خود کو خود اپنی ہی نظروں میں سرخرو کرنے کے جتن کر رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

اس کے پروموشن پر فائز اور کلثوم خاص طور پر اس کے پیچھے لگ گئے تھے کہ وہ اس خوشی میں سب کو ٹریٹ دے۔ فائز نے خود ہی پکنک کا پروگرام ترتیب دے ڈالا' جس میں لنچ سمیت دیگر تمام خرچا ماما کے ذمہ تھا۔ یوں ان سب نے آنے والا ویک اینڈ فارم ہاؤس پر ہلا گلا کرتے گزارا۔ انکل' آنٹی' بھیا بھابھی وغیرہ تو سب تھے ہی' ساتھ ہی کلثوم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اور غزل بھی اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ پکنک پر موجود تھی۔

فائز کے ساتھ اس نے زارا اور فائز کی بہن آمنہ کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ فائز کی ایک مہینے بعد زارا سے شادی ہونے والی تھی۔ وہ جتنا ہردل عزیز تھا تو سب ہی اس کی شادی کے لیے بے انتہا پرجوش تھے۔ کلثوم' غزل اور بھابھی کی طرح وہ بھی اس کی شادی میں پہننے کے لیے تین چار جوڑے بنا چکی تھی اور اسے اور زارا کو دینے کے لیے ایک شاندار سا تحفہ بھی خرید چکی تھی پکنک والے دن فائز اور آمنہ کے ساتھ زارا کو نہ دیکھ کر اس نے ہی سب سے پہلے زارا کی غیر موجودگی کی بابت دریافت کیا تھا۔

''سوری ماما! میں تمہارا انویٹیشن اسے دے نہیں پایا۔ اصل میں وہ کل یا شاید پرسوں کی فلائٹ سے نیویارک جا رہی ہے تو ظاہر ہے اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گی۔'' فائز نے مسکراتے ہوئے اس کے استفسار کا جواب دیا۔

''نیویارک؟ لیکن ابھی چھ مہینے پہلے ہی تو وہ امریکہ سے لوٹی ہے پھر اتنی جلدی دوبارہ؟''

''تو کیا چھ مہینے بعد دوبارہ جانے پر پابندی لگ جاتی ہے؟'' وہ اس کی حیرت پر مسکرایا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ابھی وہ لوگ راستے میں تھے۔ فائز کا جواب سنتے اس کی آمنہ کے چہرے پر نظر پڑی تو اسے وہاں کچھ غیر معمولی سا تاثر نظر آیا یوں جیسے یہ ذکر اسے ناخوش اور دکھی کر رہا ہو' جبکہ فائز بالکل نارمل اور مطمئن تھا۔

''بھئی' وہ امریکہ جا رہی ہے' ہمیشہ کے لیے وہاں سیٹل ہونے کے لیے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ وہیں پیدا ہوئی' پلی بڑھی اور وہیں تعلیم حاصل کی ہے تو اسے پاکستان میں نہیں وہیں پر ہی رہنا ہے۔ اگر پچھلے چند سال اس نے

پاکستان میں گزار لے۔ یہاں پر میڈیسن پڑھ لی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی ساری زندگی یہیں گزارنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ امریکہ میں سیٹل ہو جاؤں اور تمہیں تو پتا ہی ہے یار! میرا پاکستان اور اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں سیٹل ہونے کا کبھی بھی ارادہ نہیں تھا۔ چاہے وہ میری جنم بھومی امریکہ ہی کیوں نہ ہو۔ سو میں نے اس کے ساتھ امریکہ میں سیٹل ہونے سے انکار کر دیا۔ بس اس بات پر ہمارا کمپرومائز نہ ہو سکا اور آفیشلی تو نہیں البتہ ان آفیشلی ہماری منگنی ٹوٹ گئی۔

"آفیشلی تب کہلائے گی جب وہ امریکہ فلائی کر جائے گی۔ ابھی تو میں کسی انڈین فلم کے دکھیارے ہیرو کی طرح سیڈ سانگز سنتا اس انتظار میں ہوں کہ شاید وہ لاسٹ مومنٹس میں آخری لمحوں میں اپنا فیصلہ بدل دے اور یہیں رک جائے۔" پھیکے پھیکے موڈ میں مسکراتے ہوئے فائز نے ایک ایسی بات ان سب کو بتائی جسے سن کر بابا کے ساتھ ساتھ انکل اور کلثوم بھی ہکا بکا رہ گئے۔ وہ زارا علیم سے بے تحاشا محبت کرتا تھا۔

اور اس کی محبت گاڑی میں موجود کسی بھی فرد سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ سب ایسی شاک کی کیفیت میں آگئے تھے کہ فارم ہاؤس تک پہنچنے تک سب بالکل خاموش اور گم صم سے بیٹھے رہے۔ فائز اور زارا کی ایک دوسرے سے والہانہ محبت، پھر اسی محبت کے نتیجے میں دوران تعلیم ہی ہو جانے والی ان کی منگنی جو اتنے برسوں تک قائم رہنے کے بعد عین اس وقت ٹوٹ گئی جب ان کی شادی کی تیاریاں تکمیل کے آخری مراحل میں تھیں۔

"تم تو ایسے چپ ہو گئی ہو جیسے میں نے تمہیں کسی کے مرنے کی خبر سنائی ہے۔" وہ وہاں آنے کے بعد بھی بالکل خاموش تھی جبکہ باقی سب نے اپنے موڈ ٹھیک کر لیے تھے۔

"فائز! تم اسے روک کیوں نہیں رہے؟ اتنی سی بات پر اتنا بڑا فیصلہ؟"

وہ درختوں کے سائے میں ایک طرف تنہا اور خاموش کھڑی تھی۔ فائز بھی اس کے پاس وہیں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"جنہیں جانا ہوتا ہے، وہ روکنے سے رک جاتے ہیں ماہا؟" اس کا سوالیہ انداز ایسا تھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔

"تم تو یہ بات مت کہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جانے والے روکنے سے رکتے نہیں۔ کیا تم روک پائی تھیں اسے؟ نہیں نا؟ میں بھی نہیں روک پا رہا۔"

"فائز۔" وہ دکھ بھری نگاہوں سے اپنے دوست کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں ٹھہرا درد مسکراہٹ کے پیچھے بھی اسے صاف دکھ رہا تھا۔

"اسے لگتا ہے مجھے اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ اگر میں اس سے محبت کرتا تو اتنی سی بات کو ایشو نہ بناتا، اس کے ساتھ جانے سے انکار نہ کرتا۔ محبت میں شرائط نہیں رکھی جاتیں ماہا! مگر اس نے رکھیں۔ اگر میرے ساتھ جاؤ گے تو تم سے شادی کروں گی ورنہ نہیں۔ میں اسے غلط سمجھنے کے باوجود اس کی بے جا ضد مان جاتا۔ صرف اس کی محبت کی خاطر اس کے ساتھ امریکہ سیٹل ہونے کے لیے تیار ہو جاتا۔ مگر میں اپنے پاپا کا اکلوتا بیٹا ہوں، میرے علاوہ ان کے اور بیٹے نہیں جو ان کا بزنس سنبھال سکیں۔

میرے مما، پاپا کو میری ضرورت ہے اور میں انہیں چھوڑ کر کہیں اور جا بسوں؟ نہیں ماہا! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مما تک۔ پاپا کہتے ہیں وہ مینیج کر لیں گے، میں زارا کے ساتھ چلا جاؤں۔ شادی کے بعد امریکہ سیٹل ہونے جیسی کوئی بات ہمارے درمیان کبھی نہیں ہوئی تھی اس نے اپنی یہ خواہش میرے سامنے رکھی اور میرے انکار پر اپنی اس خواہش کو اپنی شرط اور اپنی ضد بنا لیا۔ ایسا تو نہیں کہ میں اسے اس کی فیملی سے دور رہنے کو کہہ رہا ہوں، اس کے والدین یہیں کراچی میں ہیں اور نہ ہی ہماری منگنی ایسی کسی شرط کے ساتھ ہوئی تھی جو یہ کہا جائے کہ میں اپنے وعدے سے مکر رہا ہوں۔

اس نے مجھے کل تک کا ٹائم دیا ہے اگر میں جانے کی حامی بھر لوں تو وہ رک جائے گی اور پھر ایک مہینے بعد شادی کر کے اور مزید پندرہ بیس روز کراچی میں قیام کر کے ہم دونوں ساتھ امریکہ چلے جائیں گے۔ اور اگر نہیں تو کل وہ اکیلی یہاں سے چلی جائے گی۔" وہ اب بہت سنجیدگی سے اسے ساری بات بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر سے مسکراہٹ کا پردہ ہٹا دیا تھا اسے فائز کے چہرے پر دکھ اور کرب واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"اس نے مجھے بتایا ہے کہ اسے مجھ سے پہلے بھی کافی شکایتیں تھیں مگر چونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لیے قصداً انہیں نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔" وہ اس کے کچھ پوچھے بغیر اسے ساری بات بتاتا چلا گیا تھا۔

"مجھے تمہیں یہ بات بتاتے ذرا سی بھی انسلٹ فیل نہیں ہوئی ماہا! کہ میری منگیتر عین شادی سے ایک مہینے پہلے مجھے چھوڑ کر چلی جانے والی ہے۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں یہ تمہارے لیے کوئی چٹخارے دار قصہ نہیں بلکہ دل کو دکھا دینے والی ایک خبر ہے۔"

وہ اسے اس کی کس کوتاہی اور کس غلطی کا احساس دلا رہا تھا، وہ جانتی تھی اور بے ساختہ ہی ندامت سے اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ اس بات کے بعد پھر پکنک کے دوران کسی وقت بھی زارا علیم کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ لنچ کے بعد سب نے اسے گفٹس، کارڈز اور پھول دے کر حیران کر دیا تھا۔ کلثوم نے، فائز نے، آنٹی انکل نے، بھیا بھابھی نے، فرح نے۔ سب کے گفٹس یہ بتا رہے تھے کہ بڑی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد خریدے گئے ہیں کہ ان میں ہر چیز سو فیصد اس کی پسند کی تھی۔

اتنا بے تحاشا پیار اور خلوص اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آیا تھا اور ساتھ ہی اس کے دل کو ندامت سے بھی دوچار کر گیا تھا۔ اتنی محبتیں اس کے گرد ہیں اور وہ پھر بھی ناشکرے پن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں چپکے چپکے یہ سوچ کر آنسو بہاتی ہے کہ اس کا کوئی گھر نہیں۔ اس کا کوئی اپنا نہیں۔ اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ سب لوگ، یہ سب اس کے اپنے ہی تو ہیں۔ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ان سب کے ساتھ خلوص اور محبت کا رشتہ ہے۔

☆ ☆ ☆

وقت کا کام گزرنا ہے، سو وہ گزر رہا تھا۔ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ۔ ہاں مگر تیز رفتاری سے گزرتا یہ وقت بے مقصد اور بے مصرف نہیں گزر رہا تھا۔ وہ اس کے دامن میں بہت سی کامیابیاں اور کامرانیاں بھی ڈال کر گیا تھا۔

ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے اسے بہت سی جگہوں پر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کی ترقی پر خوش ہونے والے بہت تھے تو حسد کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

وہ اب اپنی گاڑی رکھتی تھی اور اسے خود ڈرائیو بھی کرتی تھی۔ ہاں گھر اس کا ابھی بھی وہی ایک کمرہ تھا۔ کسی اچھے سے علاقے کے اچھے سے اپارٹمنٹ میں رہنا وہ بڑی آسانی سے افورڈ کر سکتی تھی مگر اس کی تنہائی، اس کی عمر اور اس کی خوب صورتی یہ سب اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھیں۔ کلثوم کے میکے میں ایک کمرے کے گھر میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہنا چاہے اس کی پوسٹ کے مطابق نہیں تھا مگر اس ایک کمرے کے مکان میں وہ محفوظ تو تھی۔ باہر قدم قدم پر بھیڑیے تھے اور وہ تنہا۔ اس کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے خود اپنی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہاشم امتیاز کی بیٹی کی شادی تھی۔ اپنے آفس کے ایک معمولی سے چپڑاسی کی بیٹی کی شادی میں جانے کی کس کے پاس فرصت تھی۔ کسی سینئر ایگزیکٹو، کسی ڈائریکٹر یا CEO کی بیٹی کی شادی ہوتی تو ساری مصروفیات پل بھر میں غائب ہو جاتیں۔

تحفے سے زیادہ سب کی شرکت ہاشم صاحب کے لیے اہمیت رکھتی تھی مگر وہ اپنے کولیگز کو چلنے کے لیے مجبور تو نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی گاڑی کی موجودگی کے باوجود وہ شادی میں رات کے وقت اکیلے جانے، آنے کا رسک تو ہرگز نہیں لے سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انکل یا آنٹی میں سے کسی سے اپنے ساتھ چلنے کا کہے۔ مگر اس کے ان سے بات کرنے سے پہلے ہی فائز کا اس کے پاس فون آگیا۔ وہ شادی میں جا رہا تھا اور اس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اگر اس کا جانے کا ارادہ ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

فائز کے فون نے اس کا مسئلہ حل کیا تو وہ جلدی جلدی جانے کی تیاری کرنے لگی۔ فائز کو ان کی کمپنی کو چھوڑنے اور اپنے پاپا کے آفس کو جوائن کیے کافی طویل عرصہ ہو گیا تھا مگر یقیناً اس نے ان تمام عرصہ میں ہاشم صاحب کے ساتھ رابطہ رکھا تھا تب ہی تو وہ اسے انوائٹ کرنا نہیں بھولے تھے۔

فائز عبید کا دل کتنا خوب صورت ہے۔ اسے زارا کی بدقسمتی پر نئے سرے سے افسوس ہوا۔

وہ دونوں شادی میں پہنچے تو حسب توقع ہاشم صاحب کا چہرہ انہیں دیکھ کر کھل اٹھا۔ انہوں نے ان دونوں کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ ان کے آنے پر بے پناہ خوش تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں کہاں بٹھائیں اور کس طرح ان کی خاطر کریں۔ فائز نے ان کی بوکھلاہٹ کم کرنے کی کوشش کی اور ان سے یہ کہا کہ جہاں باقی سب مہمانوں کو

تھا۔ ''ابھی انتظام کیا گیا ہے' یہ دونوں بھی وہیں بیٹھیں گے۔

ان دونوں کے بہت شدت سے منع کرنے کے باوجود بھی ہاشم صاحب نے کھانے کے وقت ان دونوں کے لیے اپنے لاؤنج کے ڈرائنگ روم میں کھانا لگوا دیا تھا۔ کسی امتیازی سلوک کو پسند نہ کرنے کے باوجود وہ دونوں ان کے اصرار کو رد کر کے ان کا دل توڑ نہیں سکے تھے۔ کھانا بہت سادہ سا تھا۔ ایک معمولی سا چپڑاسی جسے اپنی محنت کی جائز کمائی میں سات بیٹیوں اور دو بیٹوں کو تعلیم بھی دلوانی ہو اور پھر ان کی شادیاں بھی کرنی ہوں' بھی کی اس سے بہتر شادی نہیں کر سکتا تھا۔

بظاہر غیر سنجیدہ اور لاپروا سا نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا حساس تھا۔ دوسروں کے احساسات کی اسے کس قدر پروا رہتی تھی۔ وہ فائز کے اخلاص کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ واپسی میں وہ دونوں ہی بہت خوش تھے کہ آج انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے چند گھنٹے نکال کر ایک انسان کو خوشی دی تھی۔

''فائزہ! تمہیں پتا ہے اللہ نے تمہیں بہت پیارا دل دیا ہے۔ محبت اور خلوص سے بھرا ہوا۔'' گاڑی مین روڈ پر ڈالتا فائز اس تعریفی جملے پر ہنس پڑا۔

''تمہیں یہ بات آج پتا چلی ہے؟''

''نہیں پہلے سے پتا ہے۔ تم سے آج کہہ رہی ہوں۔''

''پیارا سا' محبت اور خلوص سے بھرا دل تو اللہ نے تمہیں بھی دیا ہے۔ ہم ایک جیسے ہیں تب ہی تو ہم دوست ہیں۔ وہ کیا کہا جاتا ہے کہ انسان جیسا خود ہوتا ہے ویسے ہی اس کے دوست ہوتے ہیں۔'' وہ فائز کی جوابی تعریف پر جو کہ بڑی سنجیدگی سے کی گئی تھی' بے ساختہ مسکرائی۔

''ویسے ماہا! جو تمہیں میری خوبی نظر آ رہی ہے وہی کسی کو میری سب سے بڑی خامی نظر آئی تھی۔''

''میں زارا علیم کو اس دنیا کی سب سے بدنصیب لڑکی سمجھتی ہوں۔ اسے تم جیسے اچھے انسان کا زندگی بھر کا ساتھ مل رہا تھا اور وہ۔'' وہ بولتے بولتے ایک دم ہی خاموش ہو گئی۔

''جیسے تم زارا کو بدنصیب کہہ رہی ہو' ایسے ہی میں میر رضا کو کہتا ہوں۔ ہم دونوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے غلط انسانوں کا انتخاب کیا تھا۔'' فائز نے سنجیدہ لہجے میں تبصرہ کیا اور اس نام کو سن کر

ایک پل میں ہی اس کا خوشگوار موڈ رخصت ہو گیا۔ وہ لب بھینچے فائز کو دیکھ رہی تھی۔

''ماہا! تمہیں نہیں لگتا ہم دونوں نے غلط لوگوں کو چنا۔ وہ دو لوگ ہمارے لیے درست انتخاب نہیں تھے جن سے ہم دونوں نے بہت محبت کی' جن سے ہم دونوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کیں۔ میری ہم سفر ماہا احمد علی جیسی کوئی نازک اور حساس سا دل رکھنے والی لڑکی ہونی چاہیے تھی اور تمہارا فائز عبید جیسا کوئی .... ''

''فائز! یہ کیا بے کار کی باتیں شروع کر دیں تم نے۔ چلو کسی اور ٹاپک پر بات کرتے ہیں۔'' اس نے بے ساختہ کچھ گھبرا کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ پتا نہیں گفتگو کو کس طرف لے جانے لگا تھا۔

''کسی اور ٹاپک پر نہیں۔ میں آج تم سے اسی ٹاپک پر بات کرنا چاہتا ہوں اور میں بہت دنوں سے تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ بس صرف یہ سوچ کر پریشان تھا کہ بات کس طرح کروں۔ تمہاری ناراضی سے ڈر بھی تو لگتا ہے۔''

مناسب رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتے وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا۔

''جن کی زندگیوں میں اب ہماری کوئی اہمیت نہیں' جو ہمیں بھلا کر اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن ہیں' ہم کب تک ان کے چلے جانے کا سوگ مناتے رہیں گے؟ مجھے حیرت ہوتی ہے' تم اتنے سالوں میں اس سوگ اور جوگ سے گھبرائیں نہیں۔ میں تو دو سالوں میں ہی اکتا گیا ہوں۔ بلکہ اب سوچوں تو یہ سوچ کر خود پر غصہ آتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دو قیمتی سال اس کے لیے گنوا دیے' جس کے لیے میں کوئی اہمیت رکھتا ہی نہیں۔ جسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ فائز عبید پچھلے پورے دو سالوں سے تنہا اور خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ زارا کو امریکہ گئے دو سال ہو گئے' وہ وہاں خوش باش' مگن اپنی شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے اور میں یہاں ناکام عاشقوں کی طرح اس کی یاد میں آہیں بھر رہا ہوں؟ میری زندگی اتنی فالتو اور بے مقصد تو نہیں کہ میں ایک بے حس لڑکی کے پیچھے اسے برباد کر ڈالوں۔''

وہ کچھ غصے سے یوں بولا جیسے اپنی زندگی کے دو سال ضائع ہو جانے پر خود سے برہم ہو۔

''تم شادی کر لو' فائز! دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کوئی کمی

نہیں۔'' وہ قصداً غیر معمولی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی' اس سنجیدگی میں یہ تنبیہہ چھپی ہوئی تھی کہ اس کی چند لمحے پہلے کی ادھوری بات اسے پسند نہیں آئی ہے۔

''تمہارے مشورے سے پہلے ہی میں شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں اور میرے اردگرد موجود لڑکیوں میں اچھی لڑکی صرف ایک ہی ہے اور وہ تم ہو ماہا۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ براہ راست اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نجانے یہ سوچ اس کے ذہن میں کب آئی تھی اور کیوں؟ ان کے درمیان ایسا رشتہ تو کبھی نہیں رہا تھا۔

''تم کب تک اس کم ظرف اور گھٹیا شخص کے پیچھے اپنی زندگی برباد کرو گی ماہا؟ ایسی تنہا اور اداس زندگی؟ زندگی کی سب خوشیوں پر تمہارا پورا حق ہے۔ کیا تمہیں ابھی بھی اس کا انتظار ہے؟''

''نہ مجھے اس کا انتظار ہے اور نہ میری زندگی میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے۔ میں اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔ میں اپنی زندگی میں اب کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں چاہتی۔ تم بہت اچھے ہو فائز! تمہارا نصیب یہ نہیں کہ تم ایک شادی شدہ لڑکی سے شادی کرو۔ تمہیں تو کوئی بہت پیاری سی' محبتوں سے بھرپور لڑکی ملنی چاہیے۔ چاہے وہ شخص اس قابل تھا یا نہیں مگر میں نے اس سے محبت کی تھی' اپنے دل کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ' اب میں کسی دوسرے شخص کو کیا دے سکتی ہوں؟''

اس نے بھی جواباً سیدھا فائز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدہ اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

''محبت تو میں بھی کر چکا ہوں زارا کے ساتھ' تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب میں اس محبت کی یاد میں اپنی زندگی گزار دوں ماہا! تمہیں لگتا ہے ایسا ہی میں بھی محسوس کرتا ہوں یہی کہ اب میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک نئی زندگی کی شروعات تو کر سکتا ہوں' اس کے ساتھ جسے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں' جو میری دوست ہے' جو بالکل میرے جیسی ہے۔ ہمارا دکھ ایک جیسا ہے ماہا! ہم ایک دوسرے کو دھوکا دیے بغیر' جھوٹ بولے بغیر ایک نئی زندگی کا آغاز اس امید پر کر سکتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ جب ہمارے زخم بھرتے جائیں گے تو ہماری دوستی محبت میں خود بخود ہی بدل جائے گی۔'' وہ اپنے مزاج کے

برخلاف انتہا سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

''میں تمہاری طرح نہیں سوچتی فائز! مجھے اب شادی کے نام سے بھی نفرت ہے۔ میں تمہارے خلوص کی قدر کرتی ہوں۔ مگر آئم سوری جو تم چاہتے ہو' وہ میرے لیے بالکل ناممکن ہے۔'' اس کا انکار دو ٹوک اور قطعیت بھرا تھا' فائز یکلخت ہی خاموش ہو گیا تھا۔ باقی کا راستہ ان دونوں نے خاموشی سے کاٹا تھا۔ فائز نے گاڑی گھر کے گیٹ کے سامنے لا کر روکی تو وہ دروازہ کھول کر فوراً گاڑی سے اتر گئی۔

''فائز! تم میرے انکار کا برا مت ماننا پلیز۔'' دروازہ واپس بند کر کے وہ کھڑکی میں جھک کر اس سے بولی۔

''میں نے تمہارے انکار کا برا نہیں مانا ہے' ہاں مگر میں نے اسے قبول بھی نہیں کیا ہے۔ اتنے بڑے فیصلے لمحے بھر میں نہیں ہوتے ماہا! جب میں زارا علیم جیسی خود غرض لڑکی کے لیے اپنی زندگی کے دو سال گنوا سکتا ہوں تو جسے میں بہت اچھا سمجھتا ہوں اور جو واقعی بہت اچھی ہے' اس کا جواب بدلنے کا انتظار کیوں نہیں کر سکتا؟ ماہا! تم اس بات پر دوبارہ سوچنا' ہر شخص خود غرض اور کم ظرف نہیں ہوتا۔''

اسے جواب میں کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک دم ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی اندر آ گئی تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ دوبارہ فائز سے اس موضوع پر بات کرے گی مگر جتنا وہ بات کرنے کے لیے اسے اس موضوع کی طرف لانا چاہتی اتنا ہی وہ بات کو ادھر ادھر گھما کر اسے ٹال جاتا۔ فائز نے دوبارہ اسے اس موضوع پر آنے نہیں دیا تھا۔ فائز کا اس کے ساتھ دوستانہ انداز کسی تبدیلی کے بغیر ویسا ہی تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل پہلے کی طرح ملتا اور باتیں کرتا یوں جیسے آٹھ ماہ قبل اس نے شادی کا پرپوزل ماہا کے سامنے رکھا ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی روزمرہ استعمال کی اشیاء جس اسٹور سے پہلے خریدا کرتی تھی ابھی بھی وہیں سے خریدتی تھی۔ حالانکہ اب ڈیفنس میں اس کا گھر نہیں تھا جو وہ اسٹور اس کے گھر سے قریب پڑتا ہو۔ بس اسی جگہ سے خریداری کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس لیے کبھی وہ آفس سے واپسی میں اور کبھی چھٹی والے دن وہاں آ جاتی تھی۔ اپنی

ضرورت کی اشیاء اٹھا اٹھا کر وہ تیزی سے اپنی ٹرالی میں رکھے جا رہی تھی۔ وہ کارن فلیکس کا ڈبا اور دوسری دو تین چیزیں لے کر ٹرالی میں ڈالنے کے لیے مڑی ہی تھی کہ سامنے سے اندھا دھند بھاگ کر آتی ایک چھوٹی سی بچی اس سے ٹکرائی۔

ماہا اس چیز کے لیے قطعاً" تیار نہیں تھی۔ اسی لیے اپنے ہاتھ میں موجود اشیاء کو کوشش کے باوجود سنبھال نہ پائی۔ اگر ایک طرف اس کا سامان گرا تھا تو دوسری طرف وہ بچی بھی بہت زور سے منہ کے بل چکنے ٹائلز والے فرش پر گر پڑی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ۔" وہ اپنے سامان کو چھوڑ چھاڑ بے ساختہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی اور اس بچی کو اٹھایا۔ اس کے گرنے کی آواز اتنی زوردار آئی تھی تو چوٹ بھی کافی زور سے ہی لگی ہوگی۔

"کہاں چوٹ لگی ہے بیٹا؟" وہ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو لیے ماہا کو دیکھ رہی تھی اور ماہا تیزی سے اس پر نظریں دوڑاتے یہ دیکھ رہی تھی کہ کہیں خون تو نہیں نکل رہا۔

"اس طرح سے بھاگو گی تو چوٹ تو لگے گی۔ ویسے بہادر بچے اتنی سی چوٹ پر روتے تو نہیں۔" اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے اس کے گال پر پیار کیا۔ بچی نے اس بار خاصی دلچسپی اور توجہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ گلابی ہونٹوں، سرخ گالوں اور دونوں گالوں پر خوب گہرے گہرے ڈمپلز رکھنے والی وہ بے تحاشا خوب صورت اور صحت مند بچی تھی جو شاید چار، پانچ سال کی ہوگی۔ ماہا کو وہ بہت کیوٹ اور بالکل گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت کے ساتھ ڈھیر ساری معصومیت لیے ہوئے۔ اس نے سرخ کلر کا سلیولیس فراک پہنا ہوا تھا اور بالوں کی سیدھی مانگ نکال کر بالکل سامنے کی طرف چھوٹے چھوٹے پیارے سے ہیر کلپ کلپس لگائے ہوئے تھے۔

"یہ اسٹرابیری کیا اصلی ہے؟" اس نے شرارت سے اس کے ہیئر کلپ کی طرف اشارہ کیا۔ بچی نے اس کی کم عقلی پر افسوس کرنے والے انداز میں زور زور سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جی نہیں۔"

"چاکلیٹ کھاؤ گی؟"

"جی۔"

"پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ کس اسکول میں پڑھتی ہو، پھر چاکلیٹ ملے گی۔" اسے اس بچی سے باتیں کرنے میں مزا آرہا تھا۔

"امل۔" اس نے اپنی باریک سی آواز میں اسے اپنا نام اور اپنے اسکول کا نام بتا دیا۔ وہ انگریزی بول رہی تھی۔ اسے شاید اردو سمجھنی تو آتی تھی مگر بولنی نہیں۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھر اپنی ٹرالی میں سے دو چاکلیٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑائیں جو وہ بھابھی کے بیٹے کے لیے ہر بار خرید کر لے جاتی تھی۔

"امل! تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے اور تم بھی بہت بہت پیاری ہو۔" اس نے اس کے گالوں کو ہولے سے چھوا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چاکلیٹ پکڑے بہت خوش کھڑی تھی۔

"تھینک یو آنٹی۔"

"یو آر ویلکم بیٹا۔" وہ اس کے مینرز کے مظاہرے پر مسکرائی۔

"ارے یہ کیا گرا ہے؟" ایک دم ہی اس کی نگاہ بچی کے پیروں کے پاس پڑی سونے کی چین پر پڑی۔ اس کے کہنے پر بچی نے بھی فوراً" اسی طرف دیکھا۔

"آنٹی! یہ میری ہے۔" ماہا اتنی دیر میں زمین پر سے چین اٹھا چکی تھی۔ زمین پر گرنے سے چین میں پڑا لاکٹ کھل گیا تھا اور اس میں لگی دو تصویریں فوراً" ہی اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی تھیں۔

"یہ میرے ماما، پاپا ہیں۔" بڑی خوشی کے ساتھ کچھ فخریہ سے انداز میں اس نے ماہا کو بتایا اور ماہا ان تصویروں کو دیکھ کر اپنی خوش مزاجی لمحہ بھر میں بھول چکی تھی۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ سنجیدہ اور کرخت چہرے کے ساتھ اس نے امل حمیر رضا کے ہاتھ میں اس کی چین دے دی۔

"امل بے بی! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں سب جگہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔" وہ فلپائنی عورت شاید اس کی گورنس تھی یا میڈ۔ گھبرائے ہوئے انداز میں وہ بھاگتی ہوئی بچی کے قریب آئی تھی۔ بچی کے مل جانے کے باوجود اس کے چہرے کی بوکھلاہٹ اور پریشانی غائب نہیں ہو پائی تھی۔

"میں ان آنٹی سے باتیں کر رہی تھی۔" ماہا نے نہ پھر امل حمیر رضا کی طرف دیکھا اور نہ اس فلپائنی عورت کی

طرف۔ وہ فوراً اپنی ٹرالی کی طرف بڑھی اور پھر بغیر مڑے تیزی سے اپنی ٹرالی کاؤنٹر کی طرف لے گئی۔ ال میر رضا دور سے آواز دے کر اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آئے وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ بل پے کر کے وہ تیزی سے اسٹور سے نکل آئی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ دو تصویریں آ رہی تھیں اور ساتھ ہی ال میر رضا کا من موہنا اور معصوم چہرہ۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور ایکسلیٹر پر پاؤں کا۔ اندر سے اٹھتی نفرت کی شدید لہر اسے بے قابو کر رہی تھی۔ اپنی نامرادیاں' اپنی محرومیاں اور اپنی خالی گود اس کے دکھوں اور اس کی نفرتوں کو بڑھا رہی تھی پھر نفرت کا یہ احساس خود اپنے آپ پر غصے میں بدلنے لگا۔

اس شخص کی محبت میں اندھی ہو کر اس نے اس کی ایک ناجائز بات کیوں مانی؟ ماں بننے کا اس کا فطری حق جو دنیا کا کوئی مذہب' معاشرہ اور انسان اس سے نہیں چھین سکتا تھا' اس شخص نے چھینے رکھا اور وہ اس کی محبت میں پاگل ہو کر اپنی خواہش کے برخلاف اس کا من مانا فیصلہ قبول کیے گئی۔ ذرا ہمت کر کے اس کے فیصلے کے خلاف چلی گئی ہوتی' زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا' وہ اسے چھوڑ دیتا؟ تو کیا ہوا اسے ماں کہنے والا ایک وجود۔ اگر اس کی اپنی بچی ہوتی تو کتنی بڑی ہوتی۔ وہ ماہ و سال کا حساب لگانے لگی۔ وہ اسکول جاتی ہوتی۔ پھر زندگی میں کرنے کو کتنا کچھ ہوا کرتا۔

"ماما! میرے اسکول میں پیرینٹس میٹنگ ہے۔"

"ماما! مجھے پینسل اور ربر چاہیے۔"

"ماما! مجھے سائنس کا اسائنمنٹ ملا ہے پلیز' میری ہیلپ کر دیں۔"

"ماما! میں اسپورٹس ڈے میں چلی جاؤں؟"

"ماما! میری فرینڈ کے پاس اتنا پیارا ڈول ہاؤس ہے' آپ مجھے بھی ویسا ڈول ہاؤس لا کر دیں نا۔" اس نے اپنی برابر والی خالی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں بیٹھتی اور پھر آج وہ بھابھی کے بچوں سے بھی پہلے اسے چاکلیٹس اور آئس کریم دلوا رہی ہوتی اور اب وہ اس کے برابر اس سیٹ پر اپنا سارا فرمائشی سامان اپنی گود میں لیے بہت خوش اور مگن بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بڑی خاموشی سے گرے اور اس کے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

ال میر رضا سے ملنا ایسا واقعہ نہیں تھا' جسے وہ بہت آسانی سے بھول جاتی۔ اپنے سارے دکھ اور اپنی ساری محرومیاں اسے نئے سرے سے یاد آ گئی تھیں۔ وہ اس واقعہ کو کسی اور سے تو کیا کلثوم اور فائز تک سے ڈسکس نہیں کر سکی تھی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں بتا پائی تھی کہ وہ ال میر رضا سے ملی ہے 'بالکل اتفاقاً' اور اس اتفاق نے اسے کتنے بہت سارے دنوں تک ڈسٹرب کیے رکھا ہے۔ نجانے وہ اپنے دل کی باتیں اپنے دوستوں سے کسی جھجک کے بغیر کب کہہ سکنے کے قابل ہو پائے گی؟

☆ ☆ ☆

اس واقعہ کو ایک ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا جب اس روز صبح وہ اپنے آفس میں تیزی سے کام کر رہی تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور وہ اپنے سامنے رکھے چند کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھی۔ اسی وقت اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر اس سے رابطہ کیا۔

"میم! کوئی میر رضا صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اس کی انگلیوں نے دستخط کرتے کرتے پین کو اتنی سختی سے دبایا کہ اس کی نب ٹوٹ گئی۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنے برسوں سے وہ جس شخص کے نام تک سے نفرت کرتی آ رہی تھی تو اس کی شکل دیکھنا کیسے گوارا کرتی؟ بہت مشکلوں سے اس نے اپنے غصے اور اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو ایک پروفیشنل سی ٹون کے پیچھے چھپایا اور اپنی سیکریٹری سے سنجیدگی کے ساتھ استفسار کیا۔

"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں' آپ نے پوچھا نہیں؟"

"میم! وہ کہہ رہے ہیں' انہیں آپ سے کچھ پرسنل نوعیت کا کام ہے۔" اس کی سیکریٹری جواباً شائستگی سے بولی۔

"ان سے کہیں' ابھی میں بہت بزی ہوں۔ وہ انتظار کریں۔" اپنا پروفیشنل لہجہ برقرار رکھتے ہوئے اس نے بات ختم کی۔

"پرسنل نوعیت کا کام؟" نفرت سے سوچتے اس نے زیرلب دہرایا۔ ہاں ایک پرسنل نوعیت کا معاملہ ان کے درمیان طے ہونا ابھی باقی تھا نا۔

ایک Some unfinished business

کاغذی کارروائی' اس نام نہاد رشتے کو ختم کرنے کے لیے تین الفاظ کی ادائیگی۔ مگر اس کام کے لیے بھی وہ براہ راست اس شخص سے کوئی رابطہ نہیں چاہتی تھی۔ اب وہ 'وہ ماہا احمد علی' نہیں رہی تھی جو اپنے آفس میں صرف اس شخص کی فون پر آواز سن کر ہی زار و قطار رو پڑی تھی۔ پانچ سال پہلے کی ماہا احمد علی اور آج کی ماہا احمد علی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لیے وہ پرسکون سے انداز میں اپنا کام نمٹاتی رہی۔ لنچ ٹائم شروع ہوا تو اس نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے کہا۔

"جو صاحب مجھ سے ملنے آئے تھے' وہ اگر ابھی بھی موجود ہیں تو انہیں اندر بھیج دیجیے۔"

"یس میم۔" اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر دی اور کمرے کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ چند سیکنڈز میں ہی دروازہ کھلا اور اس شخص نے اندر قدم رکھا جسے وہ مرتے دم تک بھی دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ سر اٹھا کر پراعتماد قدموں سے چلتا انتہائی قیمتی اور بہترین تراش خراش والے سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ کسی سینئر بزنس ایگزیکٹو کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ خود سے ملنے کے لیے آنے والے بزنس ایسوسی ایٹ کی طرف پیشہ ورانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"کیسی ہو ماہا؟" وہ اس کی میز کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔

"آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں مسٹر میر رضا؟" ماہا نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"ماہا! میں۔"

"ایک منٹ مسٹر رضا۔ میرا خیال ہے' میں جانتی ہوں آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں۔"

اس نے اس کی بات کاٹ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یقیناً" آپ مجھ سے divorce (طلاق) کی بات کرنے آئے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں بہتر یہی رہے گا کہ آپ یہ کام اپنے وکیل کے ذریعے کروائیے۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف ہیں کہ ہمارے پاس اس طرح کے فضول معاملات میں الجھنے کا بالکل وقت نہیں۔ آپ اپنے وکیل کے ذریعے مجھے پیپرز بھجوا دیجیے۔ It's so simple"

"ماہا! تم پلیز اس لہجے میں مجھ سے بات مت کرو۔ میں کسی ڈیوورس (طلاق) کے لیے تم سے بات کرنے نہیں آیا ہوں۔"

وہ اس کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"ایکسکیوزمی مسٹر رضا! میں نے آپ سے بیٹھنے کے لیے ہرگز نہیں کہا۔" اسے ٹوکتے وقت بھی اس کا لہجہ ہنوز پروفیشنل اور مہذب رہا۔

"میں بہت بزی ہوں۔ یہ میرا لنچ ٹائم ہے اور اس کے بعد مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے' لہٰذا آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے' وہ مختصر لفظوں میں جلدی کہہ دیجیے۔" وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ایک ٹک اس کی سمت دیکھے جا رہا تھا۔ کئی منٹ بعد وہ اس کی طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولا۔

"ماہا! میں جانتا ہوں' میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ جو کچھ ہوا' اسے بھلا کر ہم پھر سے ایک ساتھ اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں ماہا!"

"مسٹر رضا! فرسٹ نیم ٹرمز Name Terms First تو ہمارے درمیان کب کے ختم ہو چکے۔ میں آپ کے ساتھ روڈ ہونا نہیں چاہتی لیکن یہ بے تکلفی سے ماہا کہنا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے' میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"ماہا! تم مجھے جو کچھ بھی کہو' تمہیں حق ہے کہنے کا۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔ لیکن میرا یقین کرو ماہا! تم سے دور جا کر میں ایک دن بھی خوش نہیں رہا۔ میری زندگی میں واپس آ جاؤ ماہا پلیز۔ تمہارے بغیر میری زندگی بہت اداس ہے' بہت ویران ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بہت ٹھہر ٹھہر کر آہستگی سے بولا اور وہ جواباً قہقہہ لگا کر یوں ہنسنے لگی جیسے میر رضا نے اسے کوئی بہت دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔

"آج آپ ایموشنل اور جذباتی ہو رہے ہیں مسٹر رضا! جبکہ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میں اپنی حماقتوں سے نکل کر آپ کے ساتھ ایک پڑھی لکھی' ماڈرن اور میچیور عورت کی طرح لوجیکل وے (منطقی انداز) میں بات کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان جذباتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا مسٹر رضا! آپ جو کہنے آئے ہیں وہ کہیے۔ مثلاً مہر کے بارے میں۔ اب دیکھیے' آپ تو مجھے خیرات کے طور

اور جذبات کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دینے والے شخص نے خود کو اطمینان دلایا۔

"بس دو سالوں اور سات مہینوں کا ساتھ ہے۔ اس سارے عرصہ کی تمام راتیں اس نے اس لڑکی کے ساتھ بتائی ہیں' ابھی اسے زندگی سے نکلے عرصہ کتنا ہوا ہے؟ فقط ڈھائی مہینے' ڈھائی سالوں کے ساتھ کو بھلانے کے لیے ڈھائی مہینے تو بہت کم ہیں۔ فطری بات ہے۔ شروع شروع میں وہ یاد بھی آئے گی' بہت سی باتوں کے ساتھ اس کا خیال بھی آئے گا۔ پھر وقت کے ساتھ وہ ماضی کی وہ یاد بن جائے گی جسے یاد کرنے کا اسے کبھی دھیان بھی نہیں آئے گا۔"

سدرہ کے سیاہ خم دار بال اسے یک دم ہی براؤن اور سلکی نظر آنے لگے تھے۔ اس نے اس کے بالوں پر اپنے لب رکھ دیے اور اس کے بالوں میں سے آتی ایک پیاری سی' سوفٹ سی شیمپو کی خوشبو کو کچھ حیرت کے ساتھ اپنے قریب بکھرتا محسوس کرنے لگا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ سدرہ بھی وہی شیمپو استعمال کرتی تھی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اگلی صبح جب وہ باتھ روم میں نہانے گھسا تو اپنی رات کی کیفیت کو پوری طرح بھول نہیں سکا تھا' اسی لیے اس نے پہلی مرتبہ سدرہ کے شیمپو اور کنڈیشنر کو دھیان سے دیکھا۔ وہ وہ شیمپو نہیں تھا۔ لیکن کیا پتا اس کی خوشبو بھی اس شیمپو جیسی ہی ہو۔

وہ باتھ روم میں کھڑا ایک بچکانہ اور احمقانہ حرکت کر رہا تھا مگر وہاں اسے یہ سب کرتا دیکھنے والا کون تھا؟ اس نے شیمپو کی بوتل اٹھا کر اس کا ڈھکن کھولا۔ وہ ایک بالکل ہی مختلف خوشبو تھی۔ اپنی حماقتوں پر خود کو سرزنش کرتا وہ باتھ روم سے نکل آیا تھا۔ یہ امریکہ میں اس کی شاندار زندگی کا آغاز تھا۔ وہ سدرہ کے ساتھ بہت خوش تھا' اس کے توسط سے تو یہ پینٹ ہاؤس' یہ پرتعیش زندگی' یہ اونچے طبقے تک رسائی سب کچھ ملا تھا۔ کبھی سوچا بھی تھا اس نے کہ وہ اس مہنگے ترین علاقے میں ایک پینٹ ہاؤس میں رہ سکے گا؟

☆ ☆ ☆

اس صبح اسے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ باتھ روم میں شیو بناتے اس نے زور زور سے آواز لگائی۔

"ماہا! میری بلیو شرٹ اور گرے پینٹ نکال دینا۔" کہتے ہوئے اسے خود احساس نہیں ہوا کہ اس نے ایک غلط نام لے دیا ہے۔ وہ جلدی جلدی نہا کر باہر نکلا' اس یقین کے ساتھ کہ اسے اپنے کپڑے تیار رکھے ملیں گے۔ مگر وہاں پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ جھنجلائے ہوئے انداز میں منہ ہی میں کچھ بڑبڑاتا وہ کمرے سے نکلا تو ڈائننگ روم میں ٹیبل کے آگے بیٹھی سدرہ نظر آئی۔ یونیورسٹی جانے کے لیے مکمل تیار وہ نیوز پیپر دیکھ رہی تھی۔ پاکستان سے ان دونوں کے ساتھ آفاق جمیل نے اپنی ایک پرانی ملازمہ بھی بھیج دی تھی اور اس وقت وہی ملازمہ ناشتے کے لوازمات میز پر رکھ رہی تھی۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے حسیر؟" اس نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"ہاں ہو رہا ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

"جلدی کرو۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔" وہ اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈالنے لگی۔ وہ اسی کھوئے کھوئے سے انداز میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر وہ عجیب سی کیفیات کا شکار رہا۔ مگر پھر جلدی جلدی تیار ہوتے وہ اس وقتی کیفیت سے نکل کر ایک مرتبہ پھر اس زندگی کو انجوائے کرنے لگا جس کے اس نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ماہا! میری بلیک ٹائی نہیں مل رہی۔" بہت جھنجلائے ہوئے لہجے میں وہ زور سے بولا۔ وہ الماری کے سامنے کھڑا ہر طرف ہاتھ مار رہا تھا۔ سدرہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دیر تھی' اس نے ہاتھ میں پکڑا مسکارا اٹھا کر بہت غصے سے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا۔ وہ اس دھماکے پر بے ساختہ ہی گھوما اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے فوراً یہ احساس ہوا کہ ابھی ابھی اس کے منہ سے ایک غلط نام نکل گیا تھا۔

وہ فوراً سدرہ کے قریب آگیا اور اس سے روانی میں منہ سے نکلے اس نام کے لیے معذرت کی۔ وہ اس وقت سدرہ کے ساتھ ایک بہت اہم ڈنر میں جا رہا تھا۔ کافی دیر کی منت سماجت کے بعد کہیں جا کر سدرہ کا موڈ ٹھیک ہوا۔ مگر یہ صرف اس ایک روز کی بات نہیں تھی۔ ہر روز دن بھر میں نجانے کتنی بار۔

"ماہا! میرے جوتے۔"

"ماہا! میری شرٹ۔"

پر فرنیچر بخش گئے تھے۔ مگر کیا کروں۔ آپ کی کبھی ایک پینی لی بھی مقروض نہیں رہنی ہوں تو یہ احسان کیسے قبول کر لیتی۔" میں نے سارا فرنیچر پچاس ہزار میں فروخت کیا تھا۔

حساب کچھ یوں بنتا ہے مسٹر رضا کے پچاس ہزار میں سے آٹھ ہزار میں اپنے جہیز کے فرنیچر کے ڈال لوں تو بیالیس ہزار آپ کے میرے حصے میں آئے۔ یعنی میرے مہر کے ایک لاکھ روپوں میں سے بیالیس ہزار ڈال چکنے کے بعد اب آپ مجھے مہر کے اٹھاون ہزار مزید دیں گے۔" اس کی مسکراہٹ استہزائیہ اور لہجہ طنزیہ اور کاٹ دار تھا۔

"ماہا! میرے ساتھ اس طرح بی ہیو مت کرو۔ میں سچے دل اور پورے خلوص کے ساتھ تمہارے پاس واپس آیا ہوں۔ پلیز پرانی سب باتوں کو بھلا کر مجھے ایک موقع اور دو۔ میں اپنی سب غلطیوں کا ازالہ کروں گا۔" وہ ایک بار پھر بہت زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آپ کو ایک بات بتاؤں مسٹر رضا' پلیز برا مت مانیے گا' یہ دل' جذبات اور خلوص ٹائپ کے الفاظ آپ کو بالکل سوٹ نہیں کر رہے۔ ان فیکٹ آپ کے منہ سے نکلنے کے بعد یہ الفاظ بہت کڑوے اور بدصورت لگ رہے ہیں۔" وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر اپنی ٹیبل پر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

"اینی وے' میں چلتی ہوں۔ آپ کے پاس کرنے کے لیے کوئی خاص بات تو ہے نہیں اور مجھے میٹنگ میں جانے کے لیے دیر ہو رہی ہے۔" وہ اپنا موبائل اور سن گلاسز میز پر سے اٹھاتے ہوئے کرسی پر سے کھڑی ہو گئی پھر اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے اسی پروفیشنل سے انداز میں بولی۔

"آپ کو divorce (طلاق) کے سلسلے میں کوئی بات کرنی ہو تو پلیز اپنے وکیل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔"

☆ ☆ ☆

وہ کمرے سے نکل کر جا چکی تھی اور وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

"آج سولہ فروری ہے یہ بات میں نہیں بھولا اور تم بھول گئیں؟ تمہیں کیا لگتا ہے میں سولہ فروری کے دن تم سے طلاق کی بات کرنے آیا ہوں؟" اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا کر بہت کرب سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

جب وہ ساتھ تھی تو یہ دن کبھی یاد نہیں رہتا تھا اور جب وہ ساتھ نہ رہی تو یہ دن ہر سال خود اپنے آپ کو یاد کرایا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ یاد دلانے والی ساتھ نہیں رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی چھبیسویں' چالیسویں بلکہ پچاسویں سالگرہ بھی منانا چاہتی ہوں۔ یونہی تم بھول جاؤ اور یونہی میں تمہیں یاد دلاؤں۔" "میں اب یہ دن کبھی نہیں بھولتا۔ تمہارے یاد دلائے بغیر میں اس دن کو یاد رکھتا ہوں۔ تم چاہتی تھیں سال بھر میں یہ ایک دن ہم دنیا کے سب کاموں سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے ہو کر' محبتوں کا اظہار کرتے بتائیں۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم اپنی زندگی کا آنے والا ہر دن اور ہر لمحہ ایک دوسرے کے ہو کر محبتوں کے ساتھ بتائیں۔"

پر آج وہ لڑکی اتنی دور' اس قدر اجنبی لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر طنز اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ جن آنکھوں میں اپنے لیے سدا محبت اور والہانہ چاہت دیکھی تھی' آج ان میں بھا گئی نفرت اسے اندر تک ہلا گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھ سے ناراض ہو کر سو گئے تو تمہیں نیند آجائے گی؟"

یہ اس کی امریکہ میں پہلی رات تھی اور یہ آفاق جمیل کا شاندار پینٹ ہاؤس جو انہوں نے شادی کے بعد اسے اور سدرہ کو رہنے کے لیے دیا تھا اور اس پینٹ ہاؤس کے اس پرتعیش اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کمرے میں وہ نرم اور آرام دہ بیڈ پر لیٹا تھا جب دھیمے سروں میں کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ وہ سویا ہوا نہیں تھا' صرف آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ دراصل اسے نیند آ نہیں رہی تھی۔ شاید جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے۔ اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے برابر میں موجود وجود پر نظر ڈالی۔ اس کے پہلو میں وہ لڑکی سو رہی تھی جسے بہت خوشی سے یہ حق اس نے خود دیا تھا۔ بے خبر سوئی سدرہ پر اس نے اپنی نگاہیں جما دیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کی شکل بدلنے لگی۔ اس چہرے میں اب ایک دوسری شکل نظر آنے لگی تھی۔ بے ساختہ اس نے اس کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے خود سے قریب کیا۔ رات کے اس اندھیرے میں کسی کو کیا پتا چلے گا کہ وہ اپنی سوئی ہوئی بیوی میں کسے دیکھ رہا ہے۔ احساسات

"ماما! میری ٹائی۔"

"ماما! میرا رومال۔"

"ماما! میری شیونگ کریم ختم ہو گئی۔" اب اس کی ...کریم' آفٹر شیو' شیمپو' صابن' ٹوتھ پیسٹ ختم ...تو جب تک وہ وہیں دوسرے لا کر نہیں رکھ دیتا۔ وہ سال، ڈبے اور بوتلز خالی ہی رہتیں۔ پہلے تو جیسے جادو کے زور ...خالی ہونے کے بعد وہ خود بخود دوبارہ بھر جاتی تھیں۔

صبح اسے دیر ہو جاتی اور وہ گھر سے نکلتے وقت ناشتہ نہ کر پاتا تو سدرہ اسے اس کے دیر سے اٹھنے پر ٹوکتی۔ یہ کہتی کہ ...صحیح ٹائم پر جاگ گئی تھی' اس لیے وقت پر تیار بھی ہو گئی ...اور ناشتہ بھی کر لیا ہے۔ وہ رات میں اسٹڈی میں بیٹھ کر دیر تک جاگ کر کام کر رہا ہوتا اور سدرہ کمرے میں بے خبر ...رہی ہوتی تو خود بخود ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

"آج تم دیر تک جاگ کر کوئی کام نہیں کرنے والے ہو۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ہاں اس کے چکر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔" اس کے چھوٹے چھوٹے کام کب ہو جایا کرتے تھے' کبھی پتا ہی نہیں چلتا تھا ہاں اب جب وہ سب خود کرنے پڑ رہے تھے تو پتا چل رہا تھا کہ انہیں کون کیا کرتا تھا۔ ایک تھکا دینے والا مصروف دن گزار کر وہ رات میں بہت تھکا ہارا اور نڈھال' بہت دیر سے گھر لوٹتا اور بستر پر پاؤں لٹکا کر جوتوں سمیت ہی لیٹ جاتا تو دو نرم و ملائم ہاتھ ان جوتوں اور موزوں کو اتارنے آگے نہیں بڑھتے' اس کے پیروں کو ہلکے ہلکے سے دبا کر اس کی تھکن کو اتارنے کی کوشش نہ کرتے۔ اب نہ صبح اسے اپنی ٹائی کی ناٹ بندھی ملتی تھی اور نہ دیر ہو جانے پر کوئی اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اسے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کرواتا تھا اور نہ گھر سے نکلتے وقت کوئی اسے گاڑی احتیاط سے چلانے کی تاکید کرتا تھا۔

"تم مجھ پر کیا منتر پڑھ کر پھونکتی ہو؟" وہ آفس یا کہیں بھی جانے کے لیے نکل رہا ہوتا تو وہ اس کے پیچھے دروازے تک آ کر باتیں کرنے اور خدا حافظ کہنے کے دوران منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اپنی طرف سے بڑی رازداری اور چالاکی سے اسے معلوم نہ ہو سکے' کچھ پھونکا کرتی تھی۔ کچھ دن اس چیز کو دیکھتے رہنے کے بعد ایک روز اس نے دروازے پر ہی اسے کھینچ کر اپنے قریب کرتے ایسے پوچھا جیسے اس کی چوری پکڑی ہو۔

"یہ کہ میرے شوہر صاحب گھر سے جا کر کسی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی کو کبھی نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ ان کے دل' دماغ اور ان کی نگاہوں میں صرف میں رہوں' صرف میرا چہرہ رہے۔"

وہ جواباً شرارتی لہجے میں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی سلامتی اور خیریت کے ساتھ گھر واپسی کے لیے اس پر کچھ پڑھ کر دم کرتی ہے۔ ان چیزوں میں اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا لیکن اس نے ماہا کو ایسا کرنے سے کبھی روکا بھی نہیں تھا۔

کوئی کام کرتے کرتے اسے سدرہ سے کوئی بات کرنا ہوتی تو بے خیالی میں منہ سے سدرہ کے بجائے ماہا نکل جاتا۔ سدرہ کے چہرے پر فوراً غصے سے بھرپور تاثر پھیل جاتا پھر ایک بار وہ اس کی ان حرکتوں پر اس سے ٹھیک ٹھاک لڑ پڑی۔ اس نے کہا کہ اس کی مڈل کلاس بیوی جو اس کے کپڑے دھوتی تھی' استری کرتی تھی' جوتے پالش کرتی تھی' اس کے لیے کھانے پکاتی اور پھر اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی بھی تھی' اگر وہ سدرہ آفاق سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ ایسی مڈل کلاس حرکتیں کرے گی تو یہ اس کی بھول ہے۔ گھر میں ملازمہ موجود ہے' وہ اس سے اپنے کام کروائے اور جو کام ملازمہ کے کرنے کے نہیں تو وہ زحمت کر کے انہیں خود ہی سرانجام دے۔ وہ سدرہ کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

وہ امیر ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ظاہر ہے' وہ اس کے پیچھے پیچھے پھر کر مڈل کلاس بیویوں جیسے کام نہیں کر سکتی تھی۔ جب ہر کام اور ہر ضرورت وقت پر پوری ہوتے ہوتے یک دم ہونا بند ہو جائے تو جس کی وجہ سے وہ کام وقت پر ہو رہے تھے' اس کا یاد آ جانا تو ایک لازمی اور فطری بات ہے۔ ماہا کے اتنی کثرت سے یاد آنے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اب چونکہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے کام پہلے کی طرح کیے ہوئے نہیں ملتے ہیں۔ سو ان کاموں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ یاد آ جاتی ہے۔

اس نے خود کو بہت آسانی سے یقین دلایا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے کام وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ ٹینشن ہے اور اس میں ایسا کچھ نہیں کہ وہ ماہا کو اپنی زندگی میں مس کر رہا ہے۔ اسے ماہا یاد نہیں آتی۔ اس کے ذریعے انجام پانے والے اپنے کام یاد آتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے خوابوں کے حصول کی جانب کس کامیابی سے رواں دواں تھا۔ ایک ہی جست میں وہ کہاں سے کہاں پہنچا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے سینئر بینکرز' سفارت کار' بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیز کے سینئر عہدیدار' بڑے بڑے بزنس مین' اونچی پوسٹوں والے امریکی سرکاری ملازمین۔ وہ آفاق جمال کے توسط سے' ان کے ذریعے سے ان لوگوں سے مل رہا تھا جن سے ملنا کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کیا اس آدمی کے کانٹیکٹس تھے۔ کہاں کہاں پر اس کی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ واشنگٹن میں بعض ایسی مستقل سیاسی اور سماجی شخصیات تک سے ان کی سلام دعا تھی' جو وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں کافی اثر رکھتی تھیں۔

وہ اپنی زندگی کا ایک بھی پل ضائع کیے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے حق میں استعمال کر رہا تھا۔ وہ مصروف تھا' بے انتہا مصروف۔ آفاق جمال کے ذریعے حاصل ہونے والے تعلقات کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں' اس کے پاس فرصت کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ زندگی میں پیچھے وہ کیا کیا کچھ چھوڑ کر آیا تھا' اس بارے میں سوچنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ زندگی میں پیچھے مڑ کر وہ لوگ دیکھتے ہیں' جنہیں آگے بڑھنے کی جستجو اور جنون نہیں ہوتا۔ اسے پیچھے نہیں' آگے دیکھنا ہے' بہت آگے۔ اتنا آگے جہاں تک خود اس کے اپنے خوابوں کی بھی رسائی نہ ہو۔

آسمان تک اونچا اڑنے کے' بلندیوں کی انتہاؤں تک پہنچنے کے گول اور ٹارگٹس اس نے خود اپنے لیے کب سیٹ کیے تھے؟ دس سال کی عمر میں۔ ایک دس سال کا بچہ اور ایسی جنونی سوچ؟ ہاں اس نے اس ذلت سے بھری رات میں ایسا ہی سب کچھ سوچا تھا۔

وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے والدین کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سب جاننے والوں کو یہی بتایا کرتا تھا۔ جو ذرا قریبی واقف کار اور دوست تھے' انہیں ذرا سی تفصیل کے ساتھ یہ کہ اس کے والد ایک معمولی ملازم تھے اور اس نے اپنا بچپن بڑی غربت اور تنگ دستی میں گزارا ہے۔

مایا تک کو اس نے اپنی فیملی اور اپنے بچپن کے بارے میں سب کچھ سچ نہیں بتایا تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس کا باپ کپڑے کی ایک مل میں چپڑاسی تھا۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوا' وہ ٹوٹا پھوٹا ایک کمرے کا مکان' گھر کہلائے جانے کے ہرگز لائق نہیں تھا۔ شکستہ حال اور خستہ' ایک کمرے کا مکان جو ہر موسم میں اذیت دیتا تھا۔ بارشوں میں اس کی بوسیدہ چھت ایسے ٹپکتی کہ کمرے میں سوکھی کوئی چیز باقی نہیں رہ پاتی۔ ان کے بستر تک پورے کے پورے پانی سے بھیگ جاتے۔

اس نے اپنی ماں کو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی بیمار دیکھا تھا۔ اس کے باپ کو اپنی بیوی سے ہر سال بچے پیدا کروانے کا شوق جو تھا۔ جن زندگیوں کو وہ دنیا میں لے آیا تھا' انہیں ڈھنگ کی رہائش' روٹی اور لباس کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا مگر اپنے کنبے میں اضافہ سے وہ پھر بھی باز نہ آتا تھا۔

جواد رضا اس سے سولہ سال بڑا تھا اور اس کے اور جواد رضا کے بیچ میں ہر سال اس کے زندہ اور مردہ بھائی بہن پیدا ہوتے رہے تھے۔

سرکاری اسکول میں اس کا داخلہ بھی اس کا سولہ سال بڑا بھائی جواد رضا کروا کر آیا تھا۔ جواد کو پڑھنے کا شوق تھا مگر وہ پانچویں جماعت تک ہی پڑھ کر گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ کر باپ کی والی مل میں ملازمت اختیار کر گیا تھا۔ ماں باپ کی بہ نسبت جواد عمیر کا زیادہ خیال رکھ لیا کرتا تھا۔ عمیر کو اپنے اس گھر سے' اس ماحول سے' اس زندگی سے ہر چیز سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنا پھٹا پرانا بستہ لٹکا کر پیوند لگا یونیفارم پہنے اپنے گھٹیا سے سرکاری اسکول جا رہا ہوتا تو راستے میں پڑنے والے اس بڑے سے انگلش میڈیم اسکول کو حسرت سے دیکھتا۔ صبح کے وقت وہاں ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی گاڑیاں آ کر رک رہی ہوتیں اور ان میں سے صاف ستھرا' نیا یونیفارم پہنے خوش و خرم بچے اتر اتر کر اسکول کے گیٹ میں داخل ہو رہے ہوتے۔ یہ فرق کیوں تھا' اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ بچے ڈرائیورز کے ساتھ یا اپنے باپوں کے ساتھ قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر اس بڑے سے شاندار اسکول میں آتے اور وہ بھوکے پیٹ' پھٹا پرانا یونیفارم پہنے' پیدل اس سرکاری اسکول میں جاتے' جہاں کی ہر چیز سے غربت برستی تھی' جہاں کی ہر چیز اسے زہر لگتی تھی۔ اپنے گھر سے' اپنے اسکول سے' اپنی اس غربت بھری زندگی سے اسے نفرت تھی مگر یہ نفرت اس رات سے پہلے تک اتنی شدید نہیں تھی۔ اس میں ایسا جنون اور ایسا باغیانہ پن نہیں تھا۔

اوائل جنوری کی وہ رات بہت سرد تھی۔ بارش بھی زور دار اور گرج چمک کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس کی ماں بہت سخت بیمار تھی۔ وہ ایک اور بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اسے اسپتال میں داخل کرائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کا باپ سرکاری اسپتال میں بڑی مشکلوں سے اسے داخل کروا پایا تھا۔ اسپتال والوں نے ہزار منتوں کے بعد اسے داخل کر لیا تھا۔ اب اس کے باپ کے پاس بیوی کے علاج کے لیے مال بھی پیسے نہیں تھے۔ اس کی ماں مرنے کو پڑی تھی۔ اس کا فوری طور پر آپریشن کیا جانا بہت ضروری تھا اور اس کے باپ کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا۔

عمیر کو اس کا باپ اپنے ساتھ لے کر اپنے مالکوں کے گھروں پر پیسے مانگنے جا رہا تھا۔ گھروں پر قیمتی نائٹ ڈریس اور گاؤن میں ملبوس منہ میں سگار دبائے صاحبوں نے آ کر بات کرنا پسند بھی کیا تو صرف اس کے باپ کو ذلیل کرنے اور دھتکارنے کے لیے۔ "میں کہاں سے دوں پیسے' میرے پاس کوئی خزانے ہیں۔ تمہاری تو روز کی یہی کہانی ہے۔"

"صاحب! میں جلدی لوٹا دوں گا' میری بیوی مر جائے گی' میرے بچے بے آسرا ہو جائیں گے صاحب! رحم کریں۔" اس نے صاحب سے اپنے پاس کھڑے دس سال کے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے رحم کی بھیک مانگی۔

"اتنے بچے پیدا کیوں کرواتے ہو؟ جیب میں ٹکا نہیں اور بچے پیدا کروانے کا شوق ہے۔" صاحب نے اس کے باپ کو حقارت سے دھتکار دیا تھا۔

اپنی کم سنی کے باوجود اسے یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس کے باپ نے اسے اپنے ساتھ کیوں رکھا ہوا ہے۔ بارش اور سخت ترین سردی میں کسی بھی طرح کے گرم کپڑوں کے بغیر ایک دس سال کا معصوم سا بچہ جسے اس حال میں دیکھ کر لوگوں کے دل پسیج جائیں گے' ان کے دلوں میں ہمدردی اور رحم کے جذبات جاگ جائیں گے۔

پھر اس کا باپ ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے سب سے بڑے صاحب کے محل جیسے بنگلے پر آ گیا۔ کیا پتا کہ صاحب کا دل بھی اس محل جتنا ہی بڑا ہو۔ وہ وہاں پہنچے تو چوکیدار نے ان سے "صاحب سو چکے ہیں" کہہ دیا۔ بہت مایوس اس کا باپ اسے لے کر وہاں سے جیسے ہی ذرا سا پیچھے ہٹا۔ اس نے اس محل نما بنگلے کا آہنی گیٹ کھلتا اور اس میں سے ایک بہت ہی قیمتی گاڑی باہر نکلتی دیکھی۔

"صاحب!" اس کا باپ زور سے چلایا۔ اس گاڑی میں صاحب اپنی بیگم اور دو بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی تیاریاں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی شادی بیاہ کی تقریب میں جا رہے ہیں۔ اس کا باپ اندھا دھند اس گاڑی کی طرف بھاگا۔

"یو باسٹرڈ' اندھے ہو گیا' دکھائی نہیں دیتا۔" گاڑی کو بریک لگاتے صاحب نے دو چار موٹی موٹی گالیاں اس کے باپ کو دیں۔ گاڑی کی ٹکر لگنے سے وہ لڑکھڑا کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا تھا۔

"صاحب! میری بیوی بہت بیمار ہے' صاحب! مجھے تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ میں جلدی واپس کر دوں گا۔ اپنے بچوں کے سر کا صدقہ سمجھ کر ہی مجھے بھیک دے دیں صاحب! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" وہ زمین پر سے بڑی مشکلوں سے کھڑے ہوتے ہوئے رو رو کر فریاد کرنے والے انداز میں بولا۔

جبکہ صاحب کی گاڑی' اس کی آہیں اور فریاد سنے بغیر ہی دوبارہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ بے بسی سے روتا اور صاحب کو پکارتا اس کا باپ اپنے جسم سے بہتے خون اور چوٹ کے سبب دوبارہ زمین پر گر چکا تھا۔ عمیر نے ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا پھر اس نے اس محل کی طرف دیکھا۔ اس کا لان' اس کی دیواریں' اس کا گیٹ' اس کے پورچ میں کھڑی تین شاندار گاڑیوں کی طرف دیکھا جو تینوں بالکل نئے ماڈل کی تھیں اور چوتھی گاڑی جو سب سے قیمتی تھی' وہ' وہ تھی جسے وہ آدمی ابھی ابھی اس پورچ سے نکال کر لے جا چکا تھا جسے اس کا باپ صاحب کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے اس امیر کبیر شخص کے رعونت بھرے' مغرور چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ اس نے جو قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اسے بھی' زیورات اور قیمتی لباس میں سجی سنوری اس کی بیوی کو بھی اور پچھلی نشست پر بیٹھے اس کے دونوں بیٹوں کو بھی جو اسی کے جتنی عمر کے لگ رہے تھے۔

اس نے ان کی آپس میں وہ سرگوشیاں بھی دیکھی تھیں جو وہ اسے اور اس کے باپ کو دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کر رہے تھے۔ جب اس کا باپ ٹھوکر کھا کر زمین پر گرا تب اس نے اپنے باپ سے زیادہ غور سے ان دونوں لڑکوں کے قہقہے کو دیکھا تھا۔

قیمتی لباس پہنے وہ دونوں لڑکے عمیر پر ہنس رہے تھے' اس کے باپ پر ہنس رہے تھے۔ اس نے اپنی جگہ جگہ سے پھٹی قمیص کی طرف دیکھا۔ لنڈا بازار سے خریدی ہوئی

سستی سی پینٹ کی طرف دیکھا اور اپنی گھسی سی چپلوں کی طرف دیکھا جن پر موچی سے اتنی بار سلائی کروائی جا چکی تھی کہ اب گنتی کرنا بھی مشکل تھا۔ اس رات اس سڑک پر کھڑے ہو کر اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ فقیروں کی طرح اس کا باپ اسے گھر گھر بھیک مانگنے لے جا رہا تھا۔ اس کے واسطے دے کر' اس کی معصوم شکل دکھا کر لوگوں سے خیرات مانگ رہا تھا۔ اس پل چوٹ کھا کر زمین پر بے سدھ گرے اور روتے ہوئے اپنے باپ سے اسے نفرت محسوس ہوئی' شدید نفرت' بے انتہا نفرت۔ باپ کے جسم سے بہتا خون دیکھ کر بھی اسے اس پر ترس نہ آیا۔

عجیب باغیانہ اور جنونی خیالات اس کے دل میں آرہے تھے۔ جو آدمی ابھی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ انہیں دھتکار کر یہاں سے گیا ہے' وہ اس سے اس کی ہر چیز چھین لے۔ اس کی گاڑیاں' گھر' فیکٹریاں' ملیں' ساری دولت' وہ اس سے سب کچھ چھین لے۔ زمین پر گرے اپنے باپ کو اٹھانے وہ آگے نہیں بڑھا۔ اس نے سہارا دینے کو اپنے باپ کے سامنے اپنا بازو نہیں بڑھایا۔ اس نے اسے زمین پر پڑا رہنے دیا۔

وہ سوچ رہا تھا' وہ گاڑی میں بیٹھ کر ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے تو کیا وہ آسمان سے اترا تھا' نہیں۔ اس کے پاس دولت اس لیے تھی کیونکہ اس نے اس کے حصول کے لیے کوششیں کی تھیں' محنت کی تھی۔ اس نے رضا عرفان کی طرح تقدیر پر شاکر ہو کر صاحب لوگوں کے لیے چائے بنانے اور فائلیں ادھر سے ادھر لے جانے میں اپنی زندگی نہیں گنوائی تھی۔ اگر وہ ذلیل کیا جا رہا تھا تو خود اپنی وجہ سے۔ اس کے پاس دولت ہوتی' رتبہ ہوتا تو لوگ اسے انسانوں کی طرح ٹریٹ کرتے' جانوروں کی طرح نہیں۔

صبح کے قریب کہیں جا کر اس کی ماں مری تھی۔ ساری رات تڑپتے بڑی مشکلوں سے صبح سویرے اس کا دم نکلا تھا۔ پتا نہیں اس کا باپ اور بڑا بھائی اس موت پر رو کیوں رہے تھے۔ کم از کم اس کی آنکھوں سے تو ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ سب جانتے تھے' وہ مر رہی ہے' وہ مرنے والی ہے۔ اگر ان میں اس کے لیے کچھ کرنے کی ہمت ہوتی تو وہ اسے بچا نہ لیتے۔ بے بسی سے روتے بلکتے اپنے باپ سے اسے ایسی شدید نفرت ہو رہی تھی کہ وہ لفظوں میں اس کا اظہار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت تیز دوڑے گا' اتنا تیز کہ اس کی رفتار تک پہنچنا کسی دوسرے انسان کے بس کی بات نہ رہے۔ وہ رضا عرفان کا بیٹا ضرور ہے' جواد رضا کا بھائی ضرور ہے مگر وہ ان جیسا نہیں۔ وہ دنیا سے اپنا سب کچھ حاصل کرے گا' چاہے جس طرح بھی۔

رضا عرفان ٹی بی کا شکار ہو کر دو سال بعد مر گیا۔ اسے اس کے مرنے پر کوئی غم نہیں ہوا تھا۔ ہاں اپنی ماں کے مرنے کا غم ضرور چند سالوں تک اس کے ساتھ رہا' مگر اس نے خود کو یہ کہہ کر اس غم کو دل سے دور کیا کہ جلد یا بدیر اس کمزور اور بیمار عورت نے آخر کار مرنا تو اسی لاچاری اور کسمپرسی کے ساتھ تھا ہی۔ بھوک' غربت' بیماری اور ہر سال دائیوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والے بچے۔ رضا عرفان جیسے شوہر کی اس مجبور بیوی کا انجام آخر یہی ہونا تھا۔

وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ وہ اپنی زندگی کو سنوارنے کی جدوجہد کرتا۔ جواد رضا اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے وہ اسے پیسے دیا کرتا۔ اس کی بیوی کو دیور کا وجود گھر میں کھٹکتا تھا مگر وہ اپنے سے سولہ سال چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ حمیر خود چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر سچ یہ تھا کہ جواد کے دیے پیسوں کے بغیر وہ اکیلا اپنا خرچ خود نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جواد اس کی پڑھائی سے بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ خود نہیں پڑھ سکا' کم از کم اس کا چھوٹا بھائی تو اعلا تعلیم حاصل کرلے۔ جواد رضا کے مالی حالات کوئی بہت قابل رشک نہیں تھے۔ وہ رضا عرفان سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بچے تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور انہیں تینوں وقت کھانا بھی ملتا تھا۔ چاہے روکھا' سوکھا اور عام سا کھانا ہی مگر وہ جواد اور حمیر کی طرح بھوکے پیٹ نہیں سوتے تھے۔

اسے پھر بھی اپنے بھائی پر ترس آتا تھا۔ کتنے مزے سے خوشی خوشی وہ یہ پیسے جوڑ جوڑ کر خرچ کرنے والی غربت بھری زندگی جی رہا تھا؟ رضا عرفان کی طرح کنویں کا مینڈک۔ ایک روز دنیا اسے بھی روندتی آگے بڑھ جائے گی۔ اس دنیا میں صرف اس کی عزت ہے جس کے پاس دولت ہے' حیثیت ہے' دولت سے سکھ' چین' آسائش' یہاں تک کہ رشتے ناتے بھی خریدے جا سکتے ہیں اور دولت نہ ہونے پر گنوائے بھی جا سکتے ہیں۔

اس کی بھابھی کو بھی اس کی ماں کی طرح بچوں کی فوج

لی کرنے کا شوق تھا۔ ہر دو ڈھائی سال بعد آنے والے انوں سے وہ بیزار تھا۔ اسے اس چھوٹے سے دو بے نما میں ڈھنگ کی پڑھنے کی جگہ تک نہیں ملتی تھی پھر اس مسئلے کا حل اس نے غلام عباس سے دوستی کے نکالا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اس نے ی کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ اپنے کسی فیلو سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ان میں کوئی اس کے معیار کے مطابق نہیں تھا مگر غلام عباس سے دوستی کرنی پڑی۔ اس میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ تھا۔ غلام عباس کے باپ کی پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ وہاں سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدنے آتے تھے۔ حمیر کے لیے وہ جگہ یوں تھی جیسے وہ کسی شاندار لائبریری میں مفت پڑھنے کے لیے جاتا ہو۔ بغیر کسی خرچے کے وہاں اسے بہت سی اچھی اور ایسی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملا جنہیں سیکنڈ ہینڈ خریدنا بھی اس کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہیں اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کر کے ہی اس نے اپنی انگریزی کو بہتر کیا تھا۔ بہترین کتابوں کے ذریعے اپنے مختلف مضامین کے نوٹس خود بنا تا کہ اپنے سرکاری اسکول کے اساتذہ کے دیے نوٹس کبھی اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اکثر وہ ضد کر کے غلام عباس کو رات دکان پر ہی رکنے پر مجبور کر دیتا۔ غلام عباس اپنے اور اس کے لیے گھر سے کھانا لے آتا اور پھر کھانا کھا کر دکان بند کر کے زمین پر لیٹ کر سو جاتا اور حمیر ساری ساری رات جاگ کر پڑھتا رہتا۔

وہ میٹرک میں تھا جب اس نے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں نوکری کرلی۔ وہیں کے مالک ایک انگریز میاں بیوی تھے۔ وہ ریسٹورنٹ ایک مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ وہاں آنے والے تمام افراد اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے وہاں بے مقصد نوکری نہیں کی تھی۔ اسے پتا تھا وہاں کس کلاس کے افراد آتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ غیر معمولی طور پر تیز تھا اور وہ وہاں آنے والے ہر مرد کے اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے انداز کو پوری طرح اپنی نظروں میں رکھتا تھا۔ جو مرد اسے بہت اچھا لگتا ہے اس نے لباس کیسا پہنا ہے' وہ بول کس طرح رہا ہے' وہ بیٹھ کس طرح رہا ہے' وہ عورتوں سے کس انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ وہ ان تمام مینرز کو سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے آنے چاہیے تھے۔ لکھنے پڑھنے میں اچھی انگریزی کو وہ اپنے انگریز مالکوں اور وہاں آنے والے غیر ملکی افراد کے ذریعے بولنے میں بھی اچھا بنا رہا تھا۔

وہاں صرف ایک سال کام کرنے ہی سے اس نے اپنی انگریزی کو ایسا بنا لیا تھا جیسے کسی کانوینٹ کا پڑھا ہوا ہو۔

میٹرک میں اس نے بورڈ میں پوزیشن لی تھی اور شہر کے سب سے بہترین کالج میں میرٹ پر اس کا داخلہ ہوا تھا۔ اب وہ اس پسماندہ اور گھٹیا سرکاری اسکول کی فضا سے نکل آیا تھا۔ اب اس کے اساتذہ بھی اعلا تعلیم یافتہ تھے اور اس بہترین کالج میں آنے والے تمام لڑکے بھی اچھے اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

بزنس ایڈمنسٹریشن کیا بلا ہے اور بی بی اے کس چڑیا کا نام ہے' یہ جواد رضا نہیں جانتا تھا پھر بھی اسے اتنا ضرور سمجھ میں آگیا تھا کہ اس کا بھائی کسی بہت اچھی جگہ سے اعلا تعلیم حاصل کر رہا ہے مگر اس اعلا تعلیم کے حصول کے ساتھ ہی حمیر نے بھائی کے اس گھر کو چھوڑنے کی بھی بات کی' اس سے وہ بوکھلا گیا۔ اپنا گھر ہوتے چھوٹا بھائی کہیں اور کیوں جا کر رہے۔ اس نے حمیر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر اسے رکنا تھا ہی نہیں۔

اسے قائل کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو تک آگئے مگر وہ آنسو اس کے دل پر اثر نہ کر سکے۔ اپنی ذات کے لیے تھوڑا سا خودغرض اگر انسان ہو جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں پھر یہ بھی تھا کہ جواد رضا اگر اس سے محبت کرتا تھا یا بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے اس نے اسکول کے دنوں میں اسے مالی تعاون فراہم کیا تھا تو اپنی مرضی سے۔ حمیر نے خود تو کبھی اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ ہاں جب وہ اسے اس کے اخراجات کے لیے رقم دیتا تو کبھی لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ غلام عباس کو میٹرک کے بعد اور جواد رضا کو انٹر کے بعد اس نے اپنی زندگی سے باہر کر دیا تھا۔

وہ اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک کمرے کا فلیٹ شیئر کرنے لگا۔ اس کے پاس ذہانت تھی' صلاحیتیں تھیں' قابلیت تھی اور زندگی میں بہت کچھ کر دکھانے کا عزم۔ بی بی اے میں اس کے ساتھ پڑھنے والوں کی اکثریت اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جو چند مڈل کلاس کے اسٹوڈنٹس وہاں تھے بھی تو ان سے دوستی اور راہ و رسم اس نے کبھی نہیں بڑھائی۔ اس کے تمام دوست امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خود اپنا فیملی بیک گراؤنڈ کسی کو نہیں بتاتا تھا' سوائے اس کے کہ اس کے پیرنٹس کی ڈیتھ

ہو چکی ہے اور وہ اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ رہنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتا ہے۔ ایم بی اے کر لینا اس کے خوابوں کی تکمیل نہیں بلکہ وہ پہلا قدم تھا جو اسے اس کے خوابوں کی زندگی کی طرف لے جانے کے لیے اٹھا تھا۔

اس کا ایم بی اے ہو گیا' فارن بینک میں جاب مل گئی۔ ایک کمرشل ایریا میں ایک کمرے کے فلیٹ سے نکل کر وہ ایک بہتر رہائشی علاقے میں دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا جسے وہ کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا تھا۔ پچھلے فلیٹ سے چاہے وہ بہت اچھا تھا مگر پھر بھی وہ فلیٹ اور وہ علاقہ اس کے معیار کے مطابق ہرگز نہیں تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس سے بہتر علاقے میں اپارٹمنٹ فی الحال وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے کیریر کی ابتدا تھی۔ ایک دم سب کچھ کیسے آجاتا؟ کتنے مہینوں تک بچت کر کر کے اور اپنی جمع کی ہوئی ساری رقم خرچ کرنے کے بعد تو کہیں جا کر وہ ایک گاڑی خرید پایا تھا۔

اپنی جاب کی ابتدا ہی میں وہ وہاں اپنی قابلیت کو بڑی آسانی سے سب سے تسلیم کروا چکا تھا مگر اس کے باوجود بھی ابھی زندگی اس جگہ نہیں پہنچی تھی' جہاں وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا پھر اسے وہ ملی۔ ماہا احمد علی..... خوبصورت ایسی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہ چاہے اور ذہین ایسی کہ اس کی گفتگو خاموشی سے سنے بغیر رہا نہ جائے۔ وہ خوبصورتی اور ذہانت کا بڑا حسین امتزاج تھی۔ فورتھ سمسٹر کی اسٹوڈنٹس جو عنقریب ایم بی اے کر کے آئی بی اے سے پاس آؤٹ کرنے والی تھی۔

اس لڑکی کا پروفیشنل کیریر کتنا شاندار ہو گا' وہ اس سے پہلی ملاقات میں اس کی ذہانت اور قابلیت کو جانچنے کے بعد بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کے اندازے کم ہی غلط ثابت ہوتے تھے اور ماہا احمد علی اس کے اندازوں کے حساب سے ایک ذہین' قابل' اچھی عادات اور اچھے مزاج کی حامل لڑکی تھی۔ اسے ماہا احمد علی سے اس پہلی ملاقات میں ہی محبت ہوئی تھی۔ سچی محبت...." تمام فائدے نقصان سوچنے سمجھنے اور اچھائیاں برائیاں جانچ لینے کے بعد ہونے والی محبت۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ جس سے شادی کرے' وہ اسی کی طرح اعلا تعلیم یافتہ اور شاندار کیریر رکھنے والی لڑکی ہو تاکہ دونوں مل کر ویسی زندگی گزار سکیں جیسی زندگی وہ گزارنا چاہتا تھا۔

ایک ایسی لڑکی جو اس قابل ہو کہ اس کے ساتھ قدم ملا کر چلے اور زندگی کو خوبصورت سے خوبصورت بنانے میں اس کے شانہ بشانہ کام کرے مگر وہ یہ بھی ... کہ ایک کمزور فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ اتنی ... فیملی کی اعلا تعلیم یافتہ لڑکی کا مل جانا خاصا مشکل کام تھا۔

ماہا کو کہ اپنے لباس سے مڈل کلاس گھرانے کی ... آ رہی تھی مگر پھر بھی وہ یہ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ کہیں ... گھر والے اس رشتے سے انکار نہ کر دیں۔ کوئی ... اسے اٹھا کر اپنی بیٹی نہیں دے دے گا۔ اس کے بارے ... پوری چھان بین کی جائے گی۔ غربت بھرے ... ایک چپڑاسی کا بیٹا اور ایک جاہل گنوار اور غریب ... بھائی۔ دوستی کی بات دوسری ہے مگر شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ حسب نسب اور خاندان کو کس قدر اہمیت ... ہیں' وہ اچھی طرح جانتا تھا مگر وہ لڑکی تو جیسے ملی ہی ... کے مسائل کے حل کے لیے تھی۔ اس کی ماں کو ... اتار کر پھینکنے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے رسمی ... کے طور پر بھی حمیر کے بارے میں کچھ جاننے کی ... نہیں کی تھی۔ اس کی ماہا کے ساتھ شادی طے ہو گئی ... اب وہ لڑکی اس کی زندگی میں آنے والی تھی جسے اس ... ساتھ مل کر معاشی میدان میں سرگرم عمل ہونا تھا اور ... کو خوب صورت بنانے میں اس کی مدد کرنا تھی۔

اس نے تاریخ طے ہوتے ہی پہلی فرصت میں ... علاقے میں کرائے کا اپارٹمنٹ لے لیا' جہاں رہنا اس ... دیرینہ خواب تھا۔

وہ ماہا کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے آیا' وہ اس کے ساتھ ... بہت خوش تھا۔ اس کا ساتھ اسے اس کے خوابوں سے نزدیک جو کر رہا تھا لیکن وہ ماہا احمد علی' وہ تو بالکل پاگل ... وہ کہہ رہی تھی کہ وہ جاب نہیں کرے گی۔ وہ گھر پر بیٹھ ... اس کی خدمتیں کرے گی۔ اس کے منہ سے جاب سے انکار سن کر وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ایک ایم بی اے کی ہوئی لڑکی سے کیا اس لیے شادی کی تھی کہ وہ گھر بیٹھ کر مزے سے اس کی کمائی اڑائے' اس کے دیے پیسوں پر انحصار کرے' اس کی کمائی سے گھر کے سارے اخراجات چلا کر خود کو ایک سگھڑ اور مشرقی بیوی سمجھے۔ وہ ماہا احمد علی کو ... لیے ایک بوجھ بنا کر نہیں بلکہ مل جل کر بوجھ اٹھانے والی ... کر لایا تھا اور وہ اس پر بوجھ بننے کی بات کر رہی تھی۔ شکر تھا کہ وہ اسے جاب کے لیے قائل کر سکا' ورنہ اس کے ...

نے تو اس کے اوسان ہی خطا کر دیے تھے۔ جس جگہ پر رہنا وہ اکیلا افورڈ نہیں کر سکتا تھا' وہاں ماہا کے تعاون سے آرام سے رہنے لگا۔ اس نے ماہا کو بٹھا کر کبھی اخراجات کس طرح بانٹنے ہیں' انہیں سمجھایا تھا مگر وہ واقعی ذہین لڑکی تھی۔ اس کے سمجھائے بغیر سمجھ گئی تھی کہ اسے کن کن چیزوں کا خرچا اپنے ذمہ لینا ہے۔ پورے انصاف اور عدل سے وہ دونوں مل کر اپنے گھر کا خرچا چلا رہے تھے۔ وہ ماہا کے ساتھ بہت خوش تھا۔ وہ بالکل ویسی بیوی تھی جیسی بیوی اسے چاہیے تھی اور وہ محبت اس سے اتنی والہانہ کرتی تھی کہ بعض دفعہ وہ اس کی محبت کی شدت پر حیران سا رہ جاتا تھا۔ وہ یہ بات بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کرتا تھا کہ ان میں اگر کبھی کوئی لڑائی جھگڑا اور تکرار نہیں ہوتی تو صرف ماہا کی وجہ سے۔ وہ اس کی کسی بات سے اختلاف کرتی ہی نہیں تھی۔

کبھی وہ احسان مندی اور ممنونیت کا شکار ہوتا اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ یہی حال اس وقت ہوتا جب وہ اس کی خدمت کرتی' اس کے سارے کام بڑی لگن سے انجام دیتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی اس نے خود ہی حمیر کے سارے کام اپنے ذمہ لے لیے تھے اور وہ اس سے اپنے کام کروانے کا آہستہ آہستہ عادی بھی ہو گیا تھا۔ وہ صرف معاشی میدان میں اس کی ہم قدم نہ تھی۔ گھریلو امور کی انجام دہی کے لحاظ سے بھی وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی۔

کبھی وہ اس کی خدمتوں سے بہت متاثر ہوتا اور کبھی یہ سوچ کر بے نیاز ہو جاتا کہ ماہا کی اتنی خدمت اور اتنی محبت کا سبب یہ ہے کہ وہ بے آسرا اور لاوارث ہے۔ حمیر کے سوا اس کا اور کوئی آسرا نہیں۔ ایک کمینی سی سوچ اس کے اندر ابھرتی' اسے ماہا کا ممنون اور اس سے متاثر ہونے سے روک دیتی۔ یہ خدمتیں اور یہ محبتیں نظریۂ ضرورت کے تحت ہیں۔ عدم تحفظ کا شکار' لاوارث اور تنہا لڑکی۔ اگر اس سے محبت نہیں جتائے گی تو آخر جائے گی کہاں؟ جو ایک رشتہ اسے حمیر کی صورت ملا ہے' تحفظ فراہم کرنے کو۔ ظاہر ہے اسے وہ کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

کبھی اگر اسے معمولی بخار یا نزلہ کھانسی ہی ہو جاتا تو وہ اس کی تیمارداری اور خدمت میں دن رات ایک کر دیتی۔ اسے ہر پل اس کی صحت کی فکر رہتی۔ اسے لگتا کہ کام کی دھن میں وہ اپنی صحت سے غفلت برتتا ہے۔ یہ احساس دل میں رکھنے کے باوجود کہ وہ اس سے اتنی محبت اس لیے جتاتی ہے کہ اس کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں' اسے پھر بھی اس کی محبت اور والہانہ پن اچھا لگتا تھا۔ حمیر رضا کے فیصلے کبھی غلط ثابت نہیں ہوتے۔ لوگوں کے متعلق اس کی ابتدائی رائے ہمیشہ سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی۔ ماہا اس کا بہترین انتخاب تھی۔

وہ اس کے ایک یا دو بچوں کی ماں بھی بن جاتی اور آئندہ پندرہ یا بیس سالوں بعد وہ دونوں مل کر اپنا وہ خوابوں کا گھر بھی بنا لیتے جس کے ان دونوں نے مل کر ہی خواب دیکھے تھے مگر ان تمام ممکنات کی راہ میں سدرہ آفندی آ گئی۔ وہ جو سے پہلی ملاقات کے ابتدائی لمحوں میں ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور حمیر اس کے باپ کے اسٹیٹس اور اثر و رسوخ کی محبت میں' ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اس کے قریب آتی جا رہی تھی اور وہ اسے خود سے دور کرنے کے بجائے مزید قریب آنے کا موقع دے رہا تھا۔ اس دوستی اور اس تعلق کی پہل اگر سدرہ کی جانب سے ہوئی تھی تو اس میں مزید بے تکلفی اور قربت پیدا کرنے میں اس کی کوششوں کا بھی پورا پورا دخل تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کے اپنے اندر جنگ سی چھڑ جاتی۔ وہ اس لڑکی کو خود سے دور کیوں نہیں کر دیتا' اسے صاف صاف یہ کیوں نہیں بتا دیتا کہ وہ ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے' خوشگوار زندگی؟

کہاں ہے زندگی خوشگوار' یہ خوشگوار زندگی ہے کہ وہ ایک دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں کرایہ پر رہتا ہے؟ اپنی من پسند گاڑی خریدنا ہنوز اس کی استطاعت سے باہر ہے؟ یہ خوشگوار زندگی ہے کہ جس گھر کا اس نے دس سال کی عمر میں خواب دیکھا تھا' وہ اسے آئندہ بیس سالوں بعد ڈھلتی عمر میں نصیب ہوگا؟ اس کی تنخواہ جو ماہا سمیت بہت سے لوگوں کو قابل رشک لگتی ہے' اس کی اپنی نگاہوں میں تو وہ کبھی سرے سے جچی ہی نہیں۔ بس ایک مجبوری کا سودا ہے۔

حمیر رضا جسے اللہ نے ایسا ذہن اور ایسی قابلیت دی ہے کہ وہ ایک دن میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کما سکتا ہے۔ پورے ایک ماہ دن رات محنت کر کے بھی لاکھ روپیہ نہیں کما پاتا۔ وہ ایک لڑکی سدرہ آفندی اگر اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو وہ کہاں سے کہاں جا پہنچے گا۔ سدرہ کی پیش قدمیوں کا اگر وہ والہانہ انداز میں پرتپاک خیر مقدم کر رہا تو؟

گھر میں ماہا کی محبتیں اور خدمتیں اسے الجھا رہی تھیں۔

ان دنوں اس کی خدمتوں پر خوش ہونے اور فخر محسوس کرنے کے بجائے وہ الجھنے لگا تھا پھر یہ الجھن اس کے رویوں سے بھی جھلکنے لگی۔ وہ اسے کیا کہہ کر چھوڑے؟ وہ اس کے ساتھ اتنی اچھی ہے لیکن وہ ان اچھائیوں کا کیا کرے کہ یہ اچھائیاں اسے وہ زندگی نہیں دے سکتیں' جیسی زندگی وہ جینا چاہتا ہے۔

سدرہ سے شادی کر لی تو ماہا کا کیا ہوگا؟ وہ تو بالکل اکیلی ہو جائے گی۔ اس کے سوا تو اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ تو کیا وہ صرف اس لیے اپنے خوابوں کی زندگی سے منہ پھیر لے کہ اس زندگی کی طرف بڑھنے سے ماہا اکیلی رہ جائے گی۔" یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر بیٹھے پچھتاتے رہنا" "ماہا اکیلی رہ جائے گی" والے اپنے اس احمقانہ خیال کے ساتھ۔

لیکن وہ رہ جائے گی کہاں؟ وہ واقعی دنیا میں تنہا ہے۔

پڑھی لکھی لڑکی ہے' سنبھال لے گی خود۔

اس کے اپنے اندر سوال جواب ہوتے۔ اس فیصلے کے حق میں اور مخالفت میں دونوں طرح دلائل دیے جاتے۔ وہ ان دنوں ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ یک دم کوئی بھی فیصلہ کر لینا اس کے لیے ناممکن ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی یہ الجھنیں بلاوجہ اس کا رویہ تلخ کر رہی تھیں۔ وہ خوامخواہ کسی بھی چھوٹی سی بات پر جھگڑا شروع کر دیتا۔

مگر وہ تو اس کی تلخیوں کے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ نرم ہو گئی تھی۔ بہت تلاش اور کوشش کے باوجود بھی جب اسے چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ اسے نہیں ملی تو بالآخر اس نے یہی طے کر لیا کہ اسے بغیر کسی وجہ کے ہی چھوڑ دے۔

سدرہ آفندی جیسی لڑکی اسے زندگی میں پھر کبھی نہیں ملنی تھی اور وہ زندگی میں پچھتانا نہیں چاہتا اور ماہا۔۔۔ اسے اس کے لیے افسوس ہے' وہ اسے خوشی سے نہیں چھوڑ رہا۔ وہ اس کو یہ سب کچھ بتائے گا' بہت اچھی طرح۔ اچھے لہجے میں' دوستوں کے سے انداز میں۔ وہ اس کا دل دکھنے پر اس سے معذرت بھی کر لے گا۔

مگر اس کے بہت اچھے انداز اور نرم لہجے کے باوجود بھی اس بات پر ماہا کا رد عمل' پاگل پن اور جنون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس سے کتنی مشکلوں سے پیچھا چھڑا پایا' یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ سدرہ سے شادی کے کافی عرصے بعد اس نے اسے طلاق کی بات کرنے کے لیے فون کیا۔ تب تو رونا پیٹنا مچا کر اس نے اسے کام کی بات کرنے ہی نہیں دی تھی۔ اب وہ یہ اہم ترین بات کرنا چاہتا تھا۔ ماہا احمد علی واقعی خودداری اور عزت نفس سے نا آشنا تھی۔ وہ اس سے طلاق لینے سے انکار کر رہی تھی۔

✿ ✿ ✿

سدرہ نے اسے اپنے پریگننٹ ہونے کی خبر سنائی تو اس خبر پر کوئی خاص خوشی محسوس نہ کرنے کے باوجود اس نے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا۔ سدرہ چاہتی تھی کہ بچے کی پیدائش کراچی میں ہو۔ اس موقع پر وہ اپنی ممی کو اپنے قریب دیکھنا چاہتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے امریکہ آ نہیں سکتی تھیں۔ سدرہ کافی پہلے کراچی چلی گئی تھی جبکہ وہ پریگننسی کے آخری دنوں میں اپنے بہت سے کام چھوڑ کر وہاں جانے پر صرف اس وجہ سے مجبور ہوا تھا کہ اس کی غیر موجودگی پر وہ خاصی خفا تھی اور ہر فون کال میں اس خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے ڈاکٹریٹ میں مصروف تھا اور بھی کئی طرح کے اہم ترین کاموں میں اس نے خود کو مصروف رکھا ہوا تھا۔ اس کے لیے اس کا کیریئر دنیا کے ہر رشتے سے زیادہ اہم تھا مگر مجبوری بات کہ سدرہ آفندی کو ناراض کرنے کا رسک وہ بالکل نہیں لے سکتا تھا۔

ماہا کراچی میں اسے ایک دکان میں ملی تو اسے دیکھ کر اسے صرف یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ سدرہ کے سامنے اس کے پاس آ کر اس کی منتیں نہ کرنے لگے۔ اسے اپنے پاس واپس بلانے کے لیے التجائیں نہ کرنے لگے۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی تھی' اس سے نفرت کرنے کے بجائے وہ ابھی بھی اس کی محبت میں مبتلا تھی۔ اس میں انا تھی ہی نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے' اس کی واپسی کی دل و جان سے منتظر تھی۔

سدرہ تو اس کے نام سے بھی خار کھاتی تھی۔ اگر وہ پاس آ گئی تو لازمی طور پر سدرہ کا موڈ خراب ہو جائے گا لیکن شکر تھا کہ وہ پاس آئی نہیں تھی۔ ہاں اس کے دوست نے ضرور شاہ کے وفادار کا کردار نبھاتے کچھ طنز کرنے کی کوشش کی تھی۔

اگر وہ باپ بن ہی رہا تھا تو اسے بیٹے کا باپ بننا تھا مگر قسمت نے یہاں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسے بیٹی کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی مگر صرف سدرہ کی وجہ سے اس نے جھوٹی خوشی کا اظہار کیا اور جھک کر کاٹ میں لیٹی اپنی

بنی کو پیار کرنے لگا۔

"ہم اپنی بیٹی کا کیا نام رکھیں عمیر؟" اس نے سدرہ کی آواز سنی اور کہیں بہت دور یادوں کا ایک دریچہ کھل گیا۔

"ہم اپنی بیٹی کا نام امل رکھیں گے۔"

"امل۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ یہ نام لیتے وقت اسے خود اپنی آواز بہت اجنبی لگی۔ اس آواز میں کون سے دکھ بول رہے تھے؟ کون سے غم رو رہے تھے؟

"اس کا مطلب ہے' تم دل سے یہی چاہتے تھے کہ ہمارے ہاں بیٹی ہو۔ تب ہی تو پہلے سے اس کا نام بھی سوچ رکھا ہے' امل عمیر رضا۔ ہاں یہ بہت اچھا نام ہے۔" وہ جواباً مسراہٹ میں ہلاتا بمشکل مسکرایا۔

اپنی بیٹی کو جب دیکھتا اسے نجانے کیوں اس کا خیال آتا۔ اسے بچے کتنے پسند تھے' خاص طور پر لڑکیاں۔ اگر امل اس کی بیٹی ہوتی۔ ماں بن کر وہ تو خوشی سے پاگل ہی ہو جاتی۔ سدرہ نے امل کے لیے گورنس رکھی تھی۔ اگر وہ ہوتی تو اپنی بیٹی کے سب ناز نخرے خود اٹھاتی بالکل اسی طرح جیسے اس کے باپ کے اٹھاتی تھی۔ یہ وہ کس طرح کی باتیں سوچنے لگا ہے۔

ماما احمد علی اس کا بیتا ہوا کل ہے' اس کا ماضی ہے۔ جذبات' احساسات' یادیں ان سب کے لیے عمیر رضا کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔

☆ ☆ ☆

"To Homi with love" یہ ہومی کون ہے؟" وہ بیڈ پر اپنے گرد کچھ کتابیں پھیلائے بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ سدرہ نے وہاں آکر بیٹھتے یونہی ایک کتاب اٹھالی اور اس کے اوراق پلٹنے لگی۔ تیزی سے قلم چلاتے اس کے ہاتھ یک دم ساکت ہوئے تھے۔ بینکنگ پر یہ بہت مہنگی کتاب اسے ماما نے تحفہ میں دی تھی۔

"میرے دوست مجھے کہتے تھے۔"

"لیکن یہ لکھائی اور یہ انداز تو کسی لڑکی کا ہے۔"

"تو کیا میرے دوستوں میں لڑکیاں شامل نہیں ہو سکتیں؟ بالکل اسی طرح جیسے تمہارے دوستوں میں بہت سے مرد بھی شامل ہیں۔"

وہ بلاوجہ تلخ ہوا لیکن سدرہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھی' اس لیے تلخی پر دھیان دیے بغیر بولی۔

"یعنی یہ تمہارا نک نیم ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں بھی تمہیں اسی نام سے بلاتی۔ چلو خیر' اب میں تمہیں تمہارے دوستوں کی طرح ہومی ہی کہا کروں گی۔"

"نہیں۔" وہ اتنی سختی سے "نہیں" بولا کہ سدرہ تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے' یہ نام مجھے پسند نہیں ہے۔ میرے دوست بھی مجھے اس نام سے چڑتا دیکھ کر جان بوجھ کر مجھے تنگ کرنے کو یہ نام لیتے تھے۔" اپنے لہجے کی سختی کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ فوراً وضاحتی انداز میں بولا۔

"دے دیتے اسے یہ نام لینے کا حق۔ جب اس کا ہر حق چھین کر اس عورت کی جھولی میں ڈال دیا تو ایک نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس کے اندر کوئی اس سے لڑپڑا۔ اپنے اندر سے ابھرتی یہ آواز اسے بہت ڈراتی تھی۔ اس آواز کے پاس بہت سارے دلائل تھے۔ یہ آواز ہر بار اسے لاجواب کر دیتی تھی اور یہ آواز دن بھر میں نجانے کتنی بار اس کے اندر گونجا کرتی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اسے اپنے سب کام ماما سے کروانے کی عادت ہو گئی تھی' اس لیے اب جب اپنے وہ سارے چھوٹے چھوٹے کام بروقت نہیں ملتے تو ان کاموں کو انجام دینے والی کا خیال آجاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ مگر اب یہاں اتنا سارا وقت گزار لینے کے بعد اس کے جو کام ملازمہ نہیں کرتی تھی' اس نے بخوشی انہیں خود کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے تمام معمولات بالکل ترتیب اور توازن کے ساتھ انجام پا رہے تھے۔ تب وہ کیوں یاد آتی تھی؟ تب کیوں اس کا خیال آتا تھا؟ ایسی ایسی جگہوں پر اس کا خیال آجاتا تھا جہاں اس کے یاد آنے کی کوئی تک بنتی نہیں تھی۔ کسی بہت بڑے بینکر سے ملتے وقت' اپنی سیکریٹری کو کچھ سمجھاتے وقت۔ "تم مجھے اپنی سیکریٹری اپائنٹ کر لو۔ میں تمہارا سارا کام بالکل ٹھیک ٹھاک کروں گی۔"

"ہومی! مجھے پتا ہے' آسمانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار ہیں مگر پلیز کچھ دیر تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح خوش ہو لو۔" اس کا کیریر اونچائیوں کی طرف مسلسل بڑھا چلا جا رہا تھا اور ہر کامیابی پر جب وہ یہ سوچتا کہ ابھی اپنے معیار سے وہ کافی نیچے ہے تو یہ آواز اسے اس کے ناشکرے پن کا احساس دلاتی۔ "ابھی جو خوشی ملی ہے اس پر تو خوش ہو لو۔ ہاں کل سے پھر بلندیوں کی طرف اور تیز!!! شروع کر دینا۔"

☆ ☆ ☆

آفاق جمال اس کی ترقی کی رفتار پر حیران تھے۔ ان ہی کے کانٹیکٹس کو بہت خوبصورتی سے استعمال کر کے وہ تھوڑے ہی وقت میں کہیں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ انہیں لگتا کہ چند سالوں میں تو وہ انہیں پیچھے چھوڑ چکا کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہو گا۔ ان کے سارے ممن ہی کی بیساکھیاں پکڑ کر اس نے چلنا شروع کیا تھا اور محض چند سالوں ہی میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ ان بیساکھیوں کے بغیر اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔

وہ انسانوں کو اپنے فائدے کے لیے اتنی سہولت سے استعمال کر لیا کرتا تھا کہ آفاق جمال جیسا شاندار بینکنگ کیریر رکھنے والا انسان اس کی قابلیت اور ذہانت کو تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پاتا۔

وہ جائز' ناجائز' صحیح اور غلط کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ بس مگر کام ہمیشہ اس طرح کرتا کہ وہ جائز اور صحیح نظر آتا۔ اس کا کیریر دیکھنے والوں کو سو فیصد بے داغ نظر آتا اور وہ ہر لحاظ سے ایک ایماندار بینکر۔ آفاق جمال خود کو بہت ذہین' چالاک سمجھتے تھے مگر وہ تو اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ لوگ اس پر اعتبار کرتے اور وہ بڑی مہارت سے انہیں ڈبل کراس کرتا۔

کبھی وہ انہیں ہوکا دیتے تو وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا کر اس سے سب کچھ چھین کر واپس پاکستان نہیں بھیج سکتے تھے۔ وہ یہاں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ ان کے کانٹیکٹس اب ان سے زیادہ عمیر رضا کے کانٹیکٹس تھے۔ وہ سدرہ سے اگر کبھی اپنے خدشات کا اظہار کرتے تھے تو وہ ان کی یہ بات مانتی نہیں تھی کہ عمیر کبھی اسے دھوکا دے سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"ہم اپنے گھر کے لان کے ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگائیں گے۔ سرخ' گلابی' سفید بہت سے رنگوں کے گلاب۔"

اس کے خوابوں کا وہ گھر جو بیس سالوں بعد کبھی وہ بنایا تا فقط ساڑھے چار سال کی مختصر مدت میں بن چکا تھا۔ وہاں کی کنسٹرکشن' وہاں کا انٹیریئر ہر چیز بہترین تھی۔ ہر لحاظ سے اس کے معیار کے مطابق۔ نا نکر انا مین ہونے چاہئیں۔ شیشے' ایلومیم کے اور لان میں لگائی جانے والی گھاس بھی امپورٹڈ ہی ہونا چاہیے۔ اس شاندار مکان میں ہر چیز شاندار تھی اور اس کے لان میں ڈھیر سارے گلاب بھی تھے۔ ایک قطعہ میں صرف گلاب ہی گلاب کھلے تھے جو اس نے خاص طور پر کہہ کر وہاں لگوائے تھے۔

"جس نے گلابوں کی بات کی تھی' جب اسے کوئی اہمیت نہیں دی تو اس کی خواہش کو اہمیت دینے کی بھی کیا ضرورت تھی؟" تکمیل کے بعد جب وہ امریکہ سے پہلی بار اپنے گھر کو دیکھنے آیا اور اپنے اندر چھپے اس دس سال کے پھٹے پرانے کپڑے پہنے لڑکے کی خوشی پر مسکرایا تب مسکراتے مسکراتے جو اس نے گلابوں کے بارے میں سوچا تو اندر سے وہی ملامت کرتی آواز اس کی ساری مسکراہٹ چھین کر لے گئی۔ وہ اپنے گھر کے ہر کونے میں فخر اور خوشی کے ساتھ پھر رہا تھا مگر جیسی خوشی اس موقع پر اسے ہونی چاہیے تھی۔ وہ اس سے کوسوں دور تھی۔

ہر چیز اس کے خوابوں کے عین مطابق تھی اور وہ اپنے خواب کی تعبیر میں کھڑا خوشی کو ڈھونڈ رہا تھا؟ یہ لمحہ تو اس کی زندگی کا سب سے یادگار لمحہ تھا۔ آج جب یہ لمحہ اس کی دسترس میں ہے تو وہ یوں کھڑا ہے جیسے یہ لمحہ زندگی کے دوسرے عام سے لمحوں جیسا ہی تو ہے۔

سدرہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس گھر کو دیکھ کر خوش تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا گھر نہیں تھا۔ ہاں یہ اس کے شوہر کا پہلا ذاتی عالی شان گھر ضرور تھا مگر وہ اس طرح کیسے خوش ہو سکتی تھی جیسے وہ ہوتی جس کے ساتھ مل کر اس نے اس گھر کا خواب دیکھا تھا جو اس گھر کے حصول کے لیے اس کے ساتھ جدوجہد میں پوری طرح شریک تھی جو ہمیشہ ایک گھر کے لیے ترسی تھی اور جس نے "اپنا ایک شاندار سا گھر ہو" والا اس کا خواب بڑی محبتوں سے اپنی پلکوں پر سجا لیا تھا۔ وہ سدرہ کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا تھا۔

"اگر کسی دن کوئی مجھ سے زیادہ ذہین لڑکی مل گئی تو میں اور میرا فخر تو منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔" ہاں وہ اور اس کا فخر منہ ہی تو دیکھتے رہ گئے تھے۔ آج اس بیڈ روم میں وہ ایک دوسری لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ساتھ لیے کھڑا تھا۔

"میں اپنے گھر کو اگنور نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے گھر کو اور تمہیں پورا ٹائم دینا چاہتی ہوں۔"

"اپنا گھر؟" کتنے یقین سے وہ اپنا گھر کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ یہ گھر جو ان دونوں کے ملنے سے گھر بنا تھا۔

"تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گی۔ میں شام میں کوئی

اور بابا کر اس کی اور سنڈے کو بھی کچھ کر لیا کروں گی۔ میں اب انہیں بالکل بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔"

اس گول تا گھر کو جلد سے جلد حاصل کر لینے کی دھن میں اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے جو اس گھر کو حاصل کرنے کے لیے اس سے مزید محنت اور پہلے سے بھی زیادہ کام کرنے کا وعدہ کر رہی تھی۔

"تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا کہ ماما اتنی محنت کر سکتی ہے۔ میں تمہیں اتنی محنت کر کے دکھاؤں گی۔" اسے کوئی کوڑے مار رہا تھا' بہت زور زور سے۔ اس کا پورا وجود زخمی اور لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ سسک رہا تھا' وہ تڑپ رہا تھا۔

ڈھائی سالوں میں اسے خود کبھی خبر نہ ہو پائی کہ کب اس کی Calculated محبت غیر مشروط محبت میں بدل گئی۔ ہر سود و زیاں سے بے نیاز' ہر نفع نقصان سے بے پروا۔ حمیر رضا کا دل محبت کے جذبے سے بھی آشنا ہے کہ اسے یہ آشنائی ایک پیار بھرا دل رکھنے والی' محبتوں پر اندھا یقین رکھنے والی لڑکی نے دی تھی۔ کبھی اس دل کو اہمیت دی ہوتی' اس کی دھڑکنوں کو لمحہ بھر کے لیے ہی توجہ سے سنا ہوتا تو پتا چلتا بھی کہ اس دل میں وہ کسی جگہ پر خود بخود ہی بس گئی ہے۔ ماما کو چھوڑتے وقت جو کشمکش تھی' جو بے چینی اور جو الجھن تھی' وہ اسی دل کے سبب تو تھی۔

اگر پیسہ خوشی لاتا ہے تو پھر آج تو اسے دل و جان سے خوش ہونا چاہیے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ وہ ہنسنے کی کوشش کرتا ہے تو اندر دل پر قطرہ قطرہ آنسو گرنے لگتے ہیں۔

"صرف محبت میرے لیے کافی نہیں۔" یہی کہا تھا ناں ماما سے اس نے۔ صرف محبت؟ محبت کیا صرف ہوتی ہے؟

"تمہارے لیے یہ مذاق ہوگا مگر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے پھانسی کے تختے پر کھینچ کر لے جا رہا ہو۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔"

وہ ہر رات اس کے پاس آتی۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر روتی۔ اسے اپنے سینے پر واقعی ایک بوجھ سا محسوس ہوتا' اپنی قمیص کسی کے آنسوؤں سے بھیگتی ہوئی لگتی اور اپنے بازوؤں پر کسی کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کی مضبوط گرفت

-

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ تو مرا۔" یہ روتی ہوئی آواز آج بھی اس کا تعاقب کرتی تھی۔ اسے ہر پل یہی لگتا جیسے وہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے سے اپنا سارا سامان لے کر باہر نکل رہا ہو اور وہ اس کے پیچھے بھاگ کر آتی اسے روک رہی ہو۔

جب اس روز وہ اس گھر سے چلا تھا تو صرف ماما ہی کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ اپنے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ کے لیے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اپنے وجود کے اس کھوئے حصے کو اب ہر جا تلاشتا' پر وہ کھو جانے والا حصہ اسے کہیں پر بھی ملتا نہیں تھا۔

"مجھ سے ناراض ہو کر سوؤ گے تو تمہیں نیند آجائے گی؟"

"وہ رات میں لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے سدرہ سے چڑ ہونے لگتی' اسے سدرہ سے نفرت ہونے لگتی' اسے اس کا وجود ناقابل برداشت لگنے لگتا۔ پھر وہ دبے پاؤں اس کے خیالوں میں چلی آتی۔

وہ سدرہ آفاق کے ساتھ شادی کے چار ساڑھے چار سال تک بہت اچھا اور محبت کرنے والا شوہر بن کر رہا۔ مگر پھر اس کا رویہ سدرہ کے ساتھ بدلنے لگا اور پھر ان کی شادی شدہ زندگی کے تلخ اور اس کے بعد تلخ ترین دور کا آغاز ہوا۔ وہ سدرہ کو نظر انداز کرنے لگا' وہ اس کے ساتھ کہیں چلنے کو کہتی اور وہ "میرے پاس وقت نہیں ہے" کہہ کر صاف انکار کر دیتا' وہ اسے بتا کر گھر پر اپنے مہمانوں کو انوائٹ کرتی اور وہ مہمان کھانا کھا کر رخصت بھی ہو جاتے تب تک گھر واپس نہ آتا۔ نتیجتاً" وہ اس سے لڑتی' جھگڑا کرتی۔ سدرہ کو اس سے بہت ساری شکایتیں رہنے لگی تھیں۔ وہ گھر کو ہوٹل سمجھتا ہے جہاں وہ صرف سونے آتا ہے۔ وہ پیسہ کمانے کی ایسی ہوس میں مبتلا ہے کہ دولت اور اپنے کیریر کے آگے اسے اپنی فیملی نظر ہی نہیں آتی۔

وہ ان شکایتوں کی پروا کیوں کرتا' جبکہ وہ ان شکایتوں کو پیدا ہی جان بوجھ کر کر رہا تھا۔ جب تک وہ چاہتا تھا کہ سدرہ کو اس سے کوئی شکایت نہ ہو' تب تک اس نے اسے کوئی شکایت نہیں ہونے دی تھی اور اب وہ چاہتا تھا کہ سدرہ کو اس سے شکایتیں ہی شکایتیں ہوں۔ اسے اب سدرہ آفاق اور اس کے گلے شکوؤں سے کوئی غرض نہیں تھی۔

آفاق جمال سال بھر پہلے ریٹائر ہو چکے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اور ان کی بیوی نے مستقل رہائش کے لیے کراچی کو منتخب کیا تھا۔ اپنے ریٹائرڈ سسر سے اسے نہ تو اب کوئی خطرہ تھا اور نہ ان کی کوئی ضرورت جو وہ ان کی بیٹی کی ناراضیوں سے خائف ہوتا۔ بلکہ بالکل

تو یہ تھی کہ وہ در پردہ چاہتا یہی تھا کہ سدرہ اس سے تنگ آ کر خود ہی اسے چھوڑ جائے۔ کئی مہینوں تک ان کے درمیان لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ جاری رہا۔

سدرہ عام عورتوں کی طرح اس پر چلاتی اس سے لڑتی اور وہ اسے بکتا جھکتا چھوڑ کر گھر سے نکل جاتا، اگر گھر پر ہی ہوتا تو اپنے کمرے میں چلا جاتا اور اگر وہ کمرے میں آکر لڑتی تو اسے نظر انداز کر کے سونے لیٹ جاتا۔ سدرہ نے غصے میں الگ کمرے میں سونا شروع کر دیا، اس کی صحت پر اس سے کون سا فرق پڑنا تھا، اُلٹا وہ تو دل ہی دل میں خوش ہوا تھا۔ ان دونوں کے لڑائی جھگڑوں اور تلخ رویوں کا اثر ایل پر لازمی پڑ رہا تھا۔ وہ ان کو چیختا چلاتا دیکھ کر رونے لگتی تھی۔ ایل کے رونے سے اسے ہمیشہ تکلیف ہوتی۔ وہ بیٹی کی پیدائش پر چاہے خوش نہیں ہوا تھا مگر اب اپنی بیٹی سے اسے بہت پیار ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی سی گڑیا اپنی معصوم اداؤں اور پیار بھری معصومانہ باتوں سے خود ہی باپ کے دل میں اپنی محبت پیدا کروا گئی تھی۔ کئی مہینوں کے لڑائی جھگڑوں کے بعد ایک رات سدرہ اس کے کمرے میں آئی اور اسے اپنی اور ایل کی پاکستان روانگی کی اطلاع دی۔

”میں ممی، ڈیڈی کے پاس واپس جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ مجھے ایسے آدمی کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا جسے میری کوئی پروا نہیں، جس کی زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں، جو میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کبھی میرے ساتھ نہیں ہوتا۔ تم سے شادی میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تھی۔ ڈیڈی تمہارے بارے میں درست خدشات کا اظہار کرتے تھے۔ تب میں ان کی بات نہیں مانتی تھی۔ احسان فراموش اور محسن کش انسان ہو تم۔ مجھ سے اپنا کیریر بنانے اور دولت اکٹھی کرنے کے لیے شادی کی اور آج جب سب کچھ حاصل کر لیا تو مجھے چھوڑ کر واپس اسی ماما احمد علی کے پاس جانے کے بہانے تلاش کر رہے ہو۔ وہ تمہاری فیملی کلاس بیوی جو تمہارا سر اور تمہارے پاؤں دباتی تھی، تمہاری نئی حضوری کرتی تھی۔ ان پانچ سالوں میں تم میرے ساتھ تو ایک پل نہیں رہے۔ تم نے ہر پل مجھ میں اسی کی شکل ڈھونڈی ہے۔ دولت تو اکٹھی کر ہی چکے ہو۔ جاؤ اب شوق سے اسی کے پاس میں اور میری بیٹی تمہاری زندگی سے نکل رہے ہیں۔“

جو وہ چاہتا تھا وہ بڑی آسانی سے خود ہی ہو گیا تھا۔ سدرہ آفندی کے اس کی زندگی سے نکل جانے سے اس کا سارا مسئلہ ہی حل ہو رہا تھا۔ بس مسئلہ اگر تھا تو ایل کا۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سدرہ؟ وہ اس معاملے میں اسے کس قدر تنگ کر دینے کی اہلیت رکھتی تھی وہ جانتا تھا۔ فی الحال اس نے ایل کے جانے پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

”وہ سدرہ سے ایل کو چھین لے گا، چاہے جس بھی طرح۔“ ماما کا دل تو اتنا پیارا ہے کہ وہ ایل کے لیے سدرہ سے بھی اچھی ماں ثابت ہوں گی۔ سدرہ کرتی کیا ہے گورنس کے رحم و کرم پر تو چھوڑ رکھا ہے اس نے بچی کو۔ ماما تو اسے بہت پیار سے، بڑے ناز و نعم میں پالیں گی۔“ اس نے ماما کے بارے میں بہت یقین سے سوچا۔

وہ ماما کے پاس جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ تھوڑی بہت ناراضی کا اظہار کریں، وہ انہیں منا لے گا۔ وہ اس سے معافی بھی مانگ لے گا۔ اب جب اس کے پاس دولت، مرتبہ، مقام سب کچھ ہے تو بس صرف ماما ہی کی کمی ہے۔ یہ کمی دور ہو جائے پھر وہ پورے دل سے خوش ہوگا۔

ماما اور وہ دونوں مل کر اپنے خوابوں کے گھر میں رہیں گے اور ہاں ایل بھی تو۔ ایل بھی ان دونوں کے ساتھ رہے گی۔ وہ اپنی بیٹی کو سدرہ کے پاس تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ وہ سدرہ کے اپنی زندگی سے نکلنے کے فوراً بعد ہی ماما کے پاس چلا جانا چاہتا تھا۔

مگر اس کے جانے کے بعد اگلے تین ماہ اسے اس سبب امریکہ میں گزارنے پڑے کہ اپنے پروفیشن کے حوالے سے چند بہت اہم کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ اسے سولہ فروری کا بھی انتظار تھا۔ وہ ماما کے پاس واپس سولہ فروری کے دن جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ جان کر کتنی خوش ہوں گی کہ عمیر نے اس دن کو اتنے اہتمام سے یاد رکھا ہوا ہے۔

ان تین ماہ میں اس نے سدرہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، ہاں ایل سے ضرور وہ فون پر بات کیا کرتا تھا۔ آفندی جمال نے اسے سدرہ کے کراچی پہنچنے کے ایک دن بعد ہی فون کیا تھا، وہ یقیناً اسے خوب کھری کھری سنانا اور اسے دھمکانا چاہتے تھے۔ مگر اس نے ان کی فون کال سننا پسند ہی نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا جب تک سدرہ اور اس کی شادی برقرار ہے، آفاق جمال مصلحتاً خاموش رہیں گے۔ جس روز اس نے سدرہ کو طلاق دے دی پھر وہ اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل، تمام اثر و رسوخ اور ساری طاقت استعمال کر ڈالیں گے۔ اسے آفندی جمال کی طاقت کا بالکل ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا اور ان کی طاقت کے جواب میں اپنی طاقت کا بھی۔ اس بوڑھے اور زخمی شیر سے مقابلے کی جو صورت حال عنقریب اسے درپیش آنے والی تھی وہ اس کے لیے خود کو بہت پہلے ہی سے بہت اچھی طرح تیار کر چکا تھا۔ وہ آفندی جمال سے بالکل خائف نہیں تھا۔

جس روز وہ کراچی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوا، اس کا دل اس نو عمر عاشق کی طرح اچھلنے اور چھلانگیں مارنے لگا جو ایک عرصہ کی جدائی کے بعد اپنی محبوب سے ملنے والا ہو۔

✡ ✡ ✡

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب ماما کی سیکریٹری اس کے پاس آئی۔

”سر! ماما میم کا ابھی فون آیا تھا۔ وہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد آفس واپس نہیں آئیں گی۔“ وہ پچھلے چار گھنٹوں سے اس کے کیبن میں بیٹھا اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

”اس نے جواباً“ بات سمجھ لینے والے انداز میں سر تو ہلا دیا مگر کرسی پر سے اٹھا نہیں۔ دفتری اوقات ختم ہونے پر اس کی سیکریٹری اب یقیناً اپنے گھر روانگی کے لیے تیار تھی۔ جب سیکریٹری کی اپنی باس سے فون پر بات ہوئی تھی تو پھر اس نے یقیناً اسے یہ بھی بتایا ہو گا کہ ”میم! جو صاحب صبح سے آپ سے ملنے کے لیے آئے بیٹھے ہیں، وہ ابھی بھی آپ کے آفس میں موجود ہیں۔“ اور یہ بات بھی یقینی نظر آ رہی تھی کہ ماما نے اپنی سیکریٹری کو عمیر کے متعلق کچھ ہدایات جاری نہیں کی تھیں اگر کی ہوتیں تو سیکریٹری عمیر کو اس کی مرضی پر یہاں بیٹھا چھوڑ کر کبھی آفس سے نہ جاتی۔ وہ عمیر کو اپنی جگہ جم کر بیٹھا دیکھ کر شانے اچکاتی کیبن سے باہر چلی گئی۔

ماما واپس آئیں گی۔ اسے لازمی طور پر آنا ہے۔ اس سے گفتگو کو نامکمل چھوڑ کر وہ کبھی اپنے گھر نہیں جا سکتیں۔ وہ ماما سے بات کیے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں جائے گا۔

گو وہ یہ توقع لے کر یہاں نہیں آیا تھا کہ ماما اس کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کریں گی۔ لیکن اگر وہ ایسا کر رہی تھیں تو وہ اس صورت حال کا خندہ پیشانی سے سامنا کرے گا۔ کتنی دیر کی ہو گی اس کی ناراضی؟ وہ اس سے اتنی بے تحاشا محبت کرتی ہیں کہ زیادہ دیر تک اپنی ناراضی پر قائم رہ ہی نہیں پائیں گی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آفس میں لوگوں کا شور اور کاموں کی گہما گہمی ختم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سوا سات بجے تو آفس میں مکمل سناٹا پھیل چکا تھا۔ شاید اب اکا دکا ہی کوئی لوگ وہاں موجود تھے۔

ماما کا کیبن مکمل اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ وہ اسی اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس نے اٹھ کر ٹیوب لائٹ آن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ساڑھے سات بجے اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی کوریڈور میں چل رہا تھا۔ وہ اس طرف بڑھتے ایک ایک قدم کو اپنے دل سے ہم آہنگ پا رہا تھا۔ یہ کون آ رہا تھا۔ اس کا دل جانتا تھا۔ چند منٹوں بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اندر قدم رکھتے ہی اس نے سوئچ بورڈ پر تیزی سے ہاتھ چلاتے تمام لائٹس آن کر دی تھیں۔ یک دم ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا اور وہ اتنے گھنٹوں سے اندھیرے میں بیٹھے رہنے کے سبب یک دم روشنی ہو جانے پر فوراً اپنی آنکھوں کو ٹھیک سے کھول نہیں پایا۔

”آپ ابھی تک یہیں ہیں؟“ عمیر کو معلوم تھا کہ یہ ایک مصنوعی حیرت ہے، وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی بھی یہاں موجود ہے تب ہی تو ساڑھے سات بجے اپنے آفس واپس آئی تھی۔ وہ آنکھیں کھول سکنے کے قابل ہوتے ہی فوراً کرسی پر سے کھڑا ہوا اور ماما کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”ماما! تم مجھے جو سزا دینا چاہتی ہو دو، بس مجھے معاف کر دو۔“ وہ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم سے دور جا کر مجھے پتا چلا کہ تم سے دور جانا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ جس طرح تم مجھ سے محبت کرتی ہو، اسی طرح میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں صرف تم سے۔“

”اور یہ محبت کتنے دنوں تک برقرار رہے گی؟ کتنے دنوں بعد وہ دن آئے گا جب تم مجھے بتاؤ گے کہ چونکہ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو، اس لیے کسی اور کے پاس جا رہے ہو۔“ وہ در پردہ طنز سے براہ راست غصے کی طرف آئی تھی۔ کم از کم اس نے اسے ”تم“ تو کہا تھا۔ اس کے لیے اس وقت یہی بہت تھا۔

”اب ایسا کبھی نہیں ہو گا ماما! تم میرا اعتبار کرو۔“

”اعتبار کروں تمہارا؟ اس شخص کا جس نے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی اور سر کے اوپر سے آسمان چھین لیا۔ میں تمہیں کتنی بے وقوف نظر آتی ہوں عمیر

رضا؟ کتنی؟ تم پر تو اب میں مرتے دم تک بھی اعتبار نہیں کروں گی۔ کلثوم کہتی ہے اور بالکل سچ کہتی ہے کہ لوگ کچھ عرصہ کوئی جانور پالیں تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ کہیں جانے لگیں تو اپنے پالتو جانور رکھوالی کے لیے کسی عزیز یا دوست کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ تمہاری نگاہوں میں تو میری پالتو جانور جتنی اہمیت بھی نہیں تھی۔" وہ اب اس پر چلا رہی تھی۔ جس لہجے میں اس نے کبھی تیمر سے بات نہیں کی تھی' اس میں کر رہی تھی۔

"میں راستہ بھٹک گیا تھا ماہا! میرے قدم بھٹک گئے تھے۔ مگر راستہ بھٹکنے سے کیا ہوتا ہے ماہا! راستہ بھٹک کر بھی میں آیا تو تمہارے ہی پاس ہوں۔ میری منزل تم ہو ماہا۔"

"تم اور خاک فیصلہ کرو گے؟ تمہارا کوئی فیصلہ خاک نہیں ہوتا تیمر رضا! تم جیسا شاطر اور چالاک انسان ہر کام سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ کرتا ہے۔ مجھ سے شادی پلاننگ کر کے کی' مجھے چھوڑا پلاننگ کرنے کے بعد اور اب واپس آئے ہو تو کچھ پلان کرنے کے بعد ہی آئے ہو گے تم اور راستے سے بھٹکو گے؟"

"ماہا! تم میرا یقین کیوں نہیں کر رہی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بالکل سچی محبت۔ اب سے نہیں بلکہ جب ہم ساتھ تھے تب سے۔ مجھے خود اپنی محبت کی شدتوں کا ادراک نہیں تھا۔"

"تم کسی سے محبت نہیں کرتے تیمر رضا! تم کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتے۔ تم ہر کام اپنا فائدہ نقصان دیکھ کر کرتے ہو۔ انسانوں کی اہمیت تمہاری نگاہوں میں بے جان اور حقیر چیزوں سے زیادہ نہیں۔ اپنے سوا تم کسی سے محبت نہیں کرتے۔" وہ اس کے التجائیہ انداز کے جواب میں حقارت اور تنفر سے بولی۔

"ماہا! وہ وقت ہم نے ساتھ گزارا تھا' کیا اس وقت کا کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں ہے جسے یاد کر کے تمہیں یہ احساس ہو کہ میں تب بھی تم سے محبت کرتا تھا؟ ہماری زندگی کتنی خوب صورت تھی ماہا۔" وہ منت بھرے انداز میں اسے پرانے وقتوں کی یاد دلانے لگا۔

"ہم نے زندگی کب شیئر کی تھی تیمر رضا! ہم نے تو صرف ایک اپارٹمنٹ شیئر کیا تھا۔ پھر جب اس اپارٹمنٹ شیئرنگ میں تمہیں ضرورت نہ رہی تو تم کہیں اور شفٹ ہو گئے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرائی۔ "ہم یورپ یا امریکہ میں نہیں رہتے' اس لیے نکاح کے دو بول پڑھوا لیے تھے ورنہ تمہاری نظر میں ہمارے رشتے کی حقیقت یہی تھی کہ میں تمہارے ساتھ تمہارا اپارٹمنٹ شیئر کرتی تھی' تمہارا روم شیئر کرتی تھی' تمہارا بیڈ شیئر کرتی تھی۔ دن میں تمہاری فلیٹ میٹ اور رات میں میری حیثیت ایک مسٹریس کی ہو جاتی تھی۔ بیوی کی حیثیت تو تم نے مجھے کبھی دی نہیں۔"

"یہ بالکل جھوٹا الزام ہے ماہا! بالکل جھوٹا۔ تمہارا ہر الزام میں قبول کر لوں گا مگر یہ نہیں۔ میں نے تمہیں بیوی کی حیثیت دی تھی۔ تم میری بیوی تھیں' تم میری بیوی ہو۔"

"بیوی کی حیثیت؟ بیوی کو اپنے بچے کی ماں بننے سے کبھی نہیں روکا جاتا تیمر رضا! ہاں مسٹریس کو ضرور روکا جاتا ہے۔"

"ماہا! خدا کے لیے بس کرو۔ مت استعمال کرو اپنے لیے اتنے گھٹیا لفظ۔" اس کے الفاظ دل پر ایسی چوٹ لگا رہے تھے کہ وہ چلا ہی تو اٹھا تھا۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ کیسی زبان استعمال کر رہی تھی۔

"تمہاری بیوی وہ ہے جو تمہاری بیٹی کی ماں ہے اور جسے چھوڑ کر تم مجھ سے نجانے کیا لینے آئے ہو۔ خصلت ہے شاید یہ مردوں کی' ایک عورت پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔" وہ اس سے زیادہ تیز آواز میں چلائی۔

"بیوی میں ہزار برائیاں ہوں تب بھی ظالم سے ظالم شوہر تک اسے چھوڑتے وقت یہ ضرور سوچتا ہو گا کہ یہ اکیلی ہے۔ میرے بغیر یہ تنہا لڑکی کہاں جائے گی؟ کیسے جیئے گی؟ پروا کی تھی تم نے میری؟ میری عزت اور تباہی کی؟ پروا کرتے بھی کیوں' میں تمہاری بیوی تھی کب۔ آج کس ڈھٹائی سے میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہو۔ میں تمہاری دیدہ دلیری پہ اتنا حیران ہوں کہ بس۔"

وہ لب بے بسی سے اس کی سمت دیکھے چلا جا رہا تھا۔۔۔ اس سے نفرت میں اتنی انتہاؤں تک پہنچ چکی ہو گی' یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کی جنونی محبت دیکھی تھی' جو اپنی محبت کے بدلے میں اس سے اور کچھ نہ سہی محبت بھی نہیں مانگتی تھی۔ پھر وہ محبت ختم کیسے ہو گئی تھی؟

"تمہیں مجھ سے محبت تو تھی ناں ماہا! میری خاطر نہ سہی اپنی اس محبت کی خاطر ہی مجھے معاف کر دو۔" وہ بے

قدم مزید آگے بڑھا کر اس کے بالکل نزدیک ہو گیا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹی۔ اس نے اپنے قدم ایک سیکنڈ میں پیچھے ہٹائے۔ اس کے قریب ہونے کا وہ ایک سیکنڈ بھی اسے نہیں مل سکا تھا۔ وہ دوبارہ اس سے اتنے ہی فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

"محبت تو کیا' میرے دل میں تم جیسے ہوس پرست' مفاد پرست' دھوکے باز اور گھٹیا انسان کے لیے سرے سے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتی ہو تم۔" وہ غصے سے چلایا۔ "جھوٹ ہے ماہا! سراسر جھوٹ۔ میں تمہارے اس جھوٹ کو کبھی نہیں مانوں گا۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت نہ رہی ہوتی' اگر تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہ رہی ہوتی تو تم اتنے سالوں تک اس رشتے کو جڑا نہ رہنے دیتیں۔ تم پہلی فرصت میں مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر کے اپنا اور میرا ہر تعلق ختم کر دیتیں۔ یوں اتنے برسوں سے تنہا زندگی نہ گزار رہی ہوتیں۔"

"میرے دل میں تمہارے لیے محبت کا تو کیا نفرت کا جذبہ بھی نہیں ہے تیمر رضا! جذبات انسانوں کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ تم جیسے جانوروں کے لیے نہیں۔ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بے خوف و خطر بولی۔

"میں ابھی بھی نہیں مانوں گا تمہارا جھوٹ۔ اگر تم ایسا ہی سوچتی ہو تو کبھی مجھ سے طلاق کا کیوں نہیں کہا؟ کیوں ہمارے رشتے کو جڑا رہنے دیا؟ یاد ہے یہ رشتہ میں نے تمہاری خواہش پر جڑا رہنے دیا تھا۔"

"وہ اس لیے تاکہ جب تم آسمان تک کی بلندیوں کی سیر کرنے کے بعد واپس زمین پر میرے پاس آؤ' اپنی انہیں خوش فہمیوں سمیت تو میں تمہیں تمہارے منہ پر رد کر سکوں' بالکل اسی طرح دھتکار سکوں جیسے تم نے مجھے دھتکارا تھا۔ کیا اپنی بے عزتی کا بدلہ نہیں لینا تھا مجھے تم سے؟"

وہ لبوں پر تلخ مسکراہٹ لے کر استہزائیہ انداز میں زور سے ہنسی۔

"رد ہونا کیسا لگ رہا ہے تیمر رضا؟"

"ماہا! مجھے معاف کر دو پلیز۔ تمہیں کیا لگتا ہے مجھے اپنی غلطیوں کا احساس نہیں؟ غصے میں ایسی باتیں مت کہو جو تمہارا دل میرے لیے محسوس بھی نہیں کرتا۔ تمہاری محبت کی شدت سے کیا میں واقف نہیں؟ میری محبت میں کوئی کمی ہو سکتی ہے مگر تم جو محبت مجھ سے کرتی ہو وہ بالکل سچی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ پھر قدم بڑھا کر اس کے نزدیک ہوا اور آہستگی سے اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ اس کی آنکھوں میں اب ہلکی ہلکی سی نمی تیرنے لگی تھی۔ اس لڑکی کی بدگمانیاں اور اس کی نفرتیں دل کس طور سہے؟ اس نے بہت نفرت بھرے انداز میں فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کیے۔

"یہ حق تم بہت پہلے کھو چکے ہو تیمر رضا!" اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی۔ اس کے چہرے پر بے انتہا غصہ تھا۔

"ماہا! تم۔" وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو پی کر کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے تیمر کی بات کاٹ دی۔

"میں تم سے محبت نہیں کرتی اور تم سے طلاق چاہتی ہوں اور اگر تمہیں میری کہی بات کا یقین نہیں تو ثبوت میں ابھی دیے دیتی ہوں۔" اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر وہ تیز رفتاری سے کوئی نمبر ملانے لگی۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟ وہ کسے کال کر رہی تھی؟

"ہیلو فائز! میں ماہا بول رہی ہوں۔"

تیمر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ فون پر کہہ رہی تھی۔

"فائز! تم نے آٹھ' نو ماہ قبل شادی کا جو پرپوزل میرے سامنے رکھا تھا' وہ مجھے قبول ہے۔ میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔"

جس پہاڑ کی چوٹی پر وہ بڑے فخر سے' سرفرازی اور کامرانی سے سرشار کھڑا تھا' اس پر سے اسے کسی نے بہت زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ نیچے اور نیچے ایک گہری کھائی کی طرف۔

"میں چاہتی ہوں' ہماری شادی سادگی سے ہو اور جلدی ہو۔ تم اپنے ممی پاپا سے ہمارے رشتے کی بات کر لو۔"

اس کے کان اس مانوس آواز اور اجنبی لہجے کو سن ضرور رہے تھے' پہچان نہیں پا رہے تھے۔ گر کھائی کے اندر بھی رگوں کو کاٹتے اور دل کو چیرتے یہ بے رحم اور سفاک لفظ اس کی سماعتیں سن رہی تھیں۔

"کیا اب یقین میری بات کا آیا؟ ثبوت کے طور پر تمہیں اپنی شادی کا دعوت نامہ دینا پڑے گا۔" وہ فون پر بات ختم

کرنے کے بعد اس کی طرف طنز اور حقارت سے دیکھنے لگی۔

"میں فائز عبید سے شادی کر رہی ہوں حمیر رضا! اور تم سے جو واحد چیز میں چاہتی ہوں' وہ طلاق ہے۔ امید کرتی ہوں تم مجھے خلع کی طرف جانے پر مجبور نہیں کرو گے۔"

اسے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ہیں۔ اپنا چہرہ' گردن اور گریبان سب اسے بھیگے ہوئے لگ رہے تھے۔ ایسا کب ہوا؟ آخر کب؟ کب وہ لڑکی محبت کرتے کرتے اس سے نفرت کرنے لگی' زندگی کی بازی ہار جانے والا شخص اب کیا کہے؟ وہ خاموش تھا۔ وہ اپنے کانوں سے بندے' نیکلیس اتارنے لگی اور سب سے آخر میں اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی اس نے کھینچ کر اتاری۔ وہ تینوں چیزیں اب اس کی مٹھی میں تھیں۔

"آج میں تمہارا اور اپنا ہر رشتہ ختم کر رہی ہوں۔ ماہا احمد علی اور حمیر رضا' جس کہانی کے دو کردار تھے' وہ کہانی آج ختم ہوئی۔"

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور اس کی کھلی ہتھیلی پر وہ تینوں زیور ڈال دیے' جو کبھی اس نے بہت محبت سے اسے اپنے ہاتھوں سے پہنائے تھے اور جنہیں وہ کبھی خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔

کہانی ختم ہو گئی؟ کیا واقعی کہانی اس طرح لمحہ بھر میں ختم ہو جاتی ہے؟ بس ایک پل میں سب کچھ ختم؟

"جب میں تم سے ہر رشتہ ختم کر رہی ہوں تو پھر اب مجھے' تمہیں کچھ کہنے کا کوئی حق تو نہیں ہے۔ پھر بھی بغیر کسی حق کے تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں۔ تم دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکے' تم کسی کے ہو نہیں سکے' سوائے اپنے۔ مگر اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔ تم کسی کے نہیں ہوئے' کم از کم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ ورنہ جس لہجے میں آج میں تم سے بات کر رہی ہوں' اسی میں آج سے بیس سال بعد تمہاری بیٹی کرے گی۔ پھر کیا کرو گے؟ پھر کہاں جاؤ گے؟ پھر تو تم سر اٹھا کر زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

وہ اس کے سامنے سے بہت اور پروقار قدموں سے چلتی اپنی میز کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ "خدا حافظ حمیر رضا! ہمیشہ کے لیے۔"

دروازے اور حمیر کے درمیان وہی کھڑی تھی۔ درمیان سے ہٹ کر اس نے اسے جانے کا راستہ دے دیا تھا۔ سر اٹھا کر باوقار انداز میں کھڑی وہ اسے اپنی زندگی سے نکل جانے کو کہہ رہی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی رنج و ملال تھا نہ آنکھوں میں کوئی آنسو۔ وہ حمیر رضا کو آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکائے بغیر اپنی زندگی سے وداع کر رہی تھی۔

قلب منتظر نہ لمحہ بھر کے لیے
اس کی رخصت کا ہنگام درپیش ہے
وصل شیریں سے گل رنگ ماحول میں
اک کہانی کو انجام درپیش ہے
آخری بار جی بھر کے میں دیکھ لوں
کیا خبر پھر کبھی ہم ملیں نہ ملیں
شاخ فردا ثمر بار ہو کہ نہ ہو
کس کو معلوم پھر گل کھلیں نہ کھلیں
ایسی ساعت کہاں' ایسا منظر کہاں
رنگ ہی رنگ ہے' روپ ہی روپ ہے
چھاؤں آنچل کی لے لوں گھڑی دو گھڑی
پھر سفر در سفر دھوپ ہی دھوپ ہے

اس کے اور ماہا کے بیچ جو چیز حائل ہو رہی تھی وہ اس کے آنسو تھے۔ وہ اسے دیکھ لینا چاہتا تھا' بہت اچھی طرح۔ مگر اس کے آنسو اس کے چہرے کو دھندلا کر کے دکھا رہے تھے۔

"اچھا میں چلا جاتا ہوں۔ پھر کبھی تمہاری زندگی میں آؤں گا بھی نہیں۔ بس ایک بار' صرف ایک آخری بار مجھے اسی پیار بھرے مانوس لہجے میں حومی کہہ دو اور تو میں کچھ بھی نہیں مانگ رہا تم سے۔ صرف ایک چھوٹا سا لفظ ماہا! اسی پیار سے صرف ایک آخری بار مجھے حومی کہہ دو۔"

اس کے ہونٹ ہلے ضرور تھے' مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی اور اگر اس کے منہ سے یہ منت بھری آواز نکل بھی جاتی تو کیا وہ اس کی یہ خواہش پوری کرتی؟ اس پر سے نگاہیں ہٹا کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی زندگی کی بازی ہار کر یہاں سے جا رہا تھا۔

اس نے دروازہ کھولنے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کا دل کسی چھوٹے سے بچے کی طرح پیر پٹخ پٹخ کر رونے لگا۔

"مجھے نہیں جانا یہاں سے۔" اس نے دروازہ کھول لیا اور باہر قدم رکھنے لگا۔

"مجھے چھوڑ کر مت جاؤ حومی!" وہ خوشی سے

بے ساختہ بہت تیزی سے پلٹا۔
گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میز کے پاس اسی سرد اور سپاٹ انداز میں کھڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلے جانے کی منتظر۔ وہ پھر دروازے کی طرف پلٹا اور یک دم اسے یوں لگا جیسے وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آ گئی ہے۔ اس کے بالکل پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔

"میں مذاق کر رہی تھی حوی! تم نے مجھے اتنے دکھ دیے' اتنا رلایا۔ کیا میں تمہیں تھوڑا سا تنگ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چلو ہم زندگی کو وہیں سے شروع کرتے ہیں' جہاں پر ہم الگ ہوئے تھے۔"

اس بار وہ پلٹا نہیں۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ یہ صرف واہمہ ہے۔ یہ حقیقت ہو نہیں سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال رہی ہے۔

"ببیبی اپنی دیر سری حوی!" وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکرا رہی تھی۔

ارے ہاں آج تو سولہ فروری تھی۔ اسے یاد کیوں نہیں رہا۔

"ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے۔ مجھے یاد دلانا چاہیے تھا۔" وہ شرارت سے کھلکھلائی تھی۔ اور حمیر رضا کے لبوں سے کئی آہیں اور سسکیاں نکلی تھیں۔

ان کی زندگی میں سب کچھ صحیح تھا۔ پھر غلط ہونا کہاں سے شروع ہوا تھا۔ اس کی اپنی وجہ سے' اس کی طمع' اس کی حرص' اس کا لالچ۔ آسمان تک پہنچ جانے کی اس کی خواہش۔

اب کیوں نہیں ہوتے خوش؟ پا تو لیا وہ سب کچھ جو زندگی سے اپنے لیے پانا چاہتے تھے۔ کیا ہوا جو اس لڑکی کو کھو دیا جس کے بغیر زندگی کا کوئی پل سکھ سے نہیں جیا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زندگی کے پچھلے ساڑھے پانچ سالوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے۔

ستمبر کی اس گرم دوپہر جب وہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا اور وہ اس کے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ وہ کشمکش کا شکار تھا کہ ماہا سے کیسے بات کرے۔ کاش وہ پل پھر سے مل جائے۔ وہ ماہا سے سدرہ کے بارے میں کچھ نہ کہے گا۔ اب کی بار وہ اس دن کچھ غلط نہیں ہونے دے گا اور سدرہ اتفاق کو اگلے روز آفس میں صاف صاف بتا دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

زندگی ہمیں ایک اور موقع کیوں نہیں دیتی؟

ان ہی آنسو بھری نگاہوں سے اسے آخری بار دیکھ لینے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ یہ در آج اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔

"کیا آج چاند گرہن ہے یا یہ اماوس کی رات ہے؟" وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا اس عمارت کو اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سے وہ ابھی باہر نکلا تھا۔

"ایسی تاریکی' اتنا گہرا اندھیرا اور اداسی' فضائیں جیسے کسی کی موت پر نوحہ پڑھ رہی ہیں۔ کون مرا ہے آج؟" بہت دیر تک وہاں کھڑے ہو کر روتے رہنے کے بعد وہ اپنی گاڑی کے پاس آ گیا۔

"تم نے آج پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے۔ ہمارے اتنے برسوں کے تعلق میں پہلی بار۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ جو تم مجھ سے چاہتی ہو وہ میں تمہیں دے دوں گا۔ لیکن ماہا! اتنے برسوں میں اگر آج پہلی بار تم نے مجھ سے کچھ مانگ ہی لیا تھا تو جدائی کیوں؟ میرا ساتھ کیوں نہیں؟" اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے بہت شکست خوردہ انداز میں گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ راستہ طے کر کے گھر کس طرح پہنچا' اسے بالکل پتا نہیں تھا۔ اسے بس یہ پتا چل رہا تھا کہ زندگی میں دور دور تک اندھیرا ہے۔ زندگی میں اتنی بھاگ دوڑ' اتنی مشقت' اتنی افراتفری' اتنی چالاکی' اتنی ہوشیاری' اتنی دغابازی کس کے لیے؟ آخر کس کے لیے؟ یہ عالیشان مقبرہ' نوحے اور آہیں سننے کے لیے؟ تنہا بیٹھ کر رونے کے لیے؟ وہ ایک بار پھر ضبط کھو بیٹھا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس عالیشان محل میں آج وہ تنہا تھا۔ اس کے آنسو صاف کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس کا غم بانٹنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ آج جب اپنے دل پر چوٹ لگی تھی تو احساس ہوا تھا کہ جن دلوں کو اس نے توڑا تھا' جن لوگوں کو اس کی وجہ سے تکلیفیں پہنچی تھیں انہیں بھی ایسا ہی درد ہوتا ہو گا' اسے صرف اس لڑکی کا ساتھ چاہیے۔ اسے صرف ماہا احمد علی چاہیے پورچ میں کوئی گاڑی آ کر رکی تھی۔ روتے روتے اس نے سر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ امل گاڑی سے اتر رہی تھی۔ جب سے وہ پاکستان آیا تھا' سدرہ' امل کو ڈرائیور کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے بھیج دیا کرتی تھی۔ وہ امل کو یہ سے ملنے سے نہیں روکتی تھی۔

امل اسے لان میں دیکھ کر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اس کی طرف آئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"ہیلو پاپا!" اس سے بولا نہیں جا رہا تھا ورنہ ہمیشہ کی طرح اسے سلام کی جگہ ہیلو کہنے پر ٹوکتا ضرور۔ ان لمحوں میں امل کا آ جانا کیسا جاں فزا لگا تھا۔ اس گھٹن اور حبس میں جیسے کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آ گیا تھا۔ حمیر نے بیٹی کے ماتھے پر پیار کیا۔

"پاپا! آپ رو رہے ہیں؟" امل نے اس کی ٹھوڑی پر انگلی لگاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

"ایک شہزادی تھی بہت اچھی' بہت پیار کرنے والی۔ آج پاپا نے اسے کھو دیا ہے بیٹا۔" اسے اپنے ساتھ لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف ضرور کر رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ باپ کی بات آئی تھی اور نہ اس کا رونا۔

"آج اس نے مجھے میری بہت بدصورت شکل دکھائی ہے امل! بہت بدصورت بہت کریہہ۔ میں پاتال میں اتر رہا ہوں۔ اپنی کس کس غلطی کو یاد کروں؟ کس کس پر روؤں؟" وہ چار سال کی بچی کیسے سمجھتی ان لفظوں کا مفہوم جو باپ کو کوئی تسلی کوئی دلاسا دے پاتی۔

"تم کسی کے نہیں ہوئے' کم از کم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔" کچھ دیر پہلے کی سنی بات اچانک اس کی سماعتوں میں گونجی' اس نے کھینچ کر امل کو اپنے بازوؤں میں چھپا لیا اور اس کے بالوں پر والہانہ انداز میں پیار کرنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو' میں صرف خود سے محبت کرتا ہوں۔ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں۔ دوسروں کے احساسات تو میرے لیے کچھ معنی رکھتے ہی نہیں۔ تمہارے پاس واپس گیا تو بھی صرف اپنی خوشی کا سوچا اور امل اپنی بیٹی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ اسے اس کی ماں سے چھین لوں گا۔ اپنے سیاہ نامۂ اعمال میں ایک اور گناہ لکھواؤں گا۔ ایک ماں سے اس کی بیٹی کو چھین کر۔ تمہارے پاس واپس گیا تو اس عورت کے بارے میں ایک پل کر نہ سوچا۔ جو میری بیوی' میری بچی کی ماں ہے سچی محبت سیکھی بھی تو اعلا ظرفی اور وسعتِ قلبی بھی سیکھنی تھی۔ خود غرضی اور محبت ایک ہی دل میں ساتھ ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟"

وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا اور اہل کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ اس کے رخساروں پر پیار کر رہا تھا۔

اللہ نے اسے ایک محبتوں سے بھرا گھر اور ایک جان نچھاور کرنے والی بیوی دی تھی۔ اس کی اوقات سے بہت زیادہ۔ وہی ناشکرا اُکتا اُ اللہ کی عطاؤں کی قدر نہ کر سکا۔ گزرتے وقت کے ساتھ شاید بابا بھی اسے معاف کر دیتے مگر وہ خود اپنے آپ کو کیسے معاف کر پائے گا؟ اس کے دل کی عدالت اسے مجرم قرار دے چکی تھی۔ اب تو ساری زندگی نداماتوں اور پچھتاووں کے ساتھ گزارنی تھی۔

"میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ میری بیٹی میں سب عادتیں تمہارے جیسی ڈال دے۔ تمہارا جیسا محبتوں سے بھرا دل، تمہارا جیسا خلوص، تمہارے جیسی سادگی، تمہاری جیسی مروت۔ سب کچھ تمہارے جیسا ہو بس قسمت تم سے مختلف ہو۔ اس کے نصیب میں کوئی عمیر رضا نہ ہو۔"

اس نے اپنا نام بہت نفرت سے لیا تھا۔

اہل کے چہرے پر اب بیزاری نظر آنے لگی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ موجود تھا۔

"اہل ابا کے پاس چلیں؟" وہ بیٹی کی خاطر مسکرایا۔ اہل نے بہت خوشی سے فوراً" زور و شور سے اقرار میں گردن ہلائی۔ اس نے اہل کو گود سے اتار کر واپس نیچے کھڑا کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر پورچ کی طرف آ گیا۔

"میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گا مجھے نہیں معلوم مگر میں نے پھر بھی جینا تو ہے، اپنی بیٹی کی خاطر۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ اہل جوش و خروش سے بولتی اسے نجانے اپنے کون کون سے دوستوں کے قصے سنا رہی تھی اور وہ گاڑی چلاتا بے دھیانی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا رخ آذق جمال کے گھر کی طرف تھا، جہاں سے اسے سدرہ کو واپس اپنے گھر لانا تھا۔ اپنی بیٹی کی ماں کو واپس اپنے گھر لانا تھا۔

"بابا! میری دعا ہے تم ہمیشہ خوش رہو۔ میرے ساتھ نہ سہی کسی اور کے ساتھ سہی لیکن تم خوش رہو۔ جو زیادتیاں میں نے تمہارے ساتھ کیں، فائز عبید ان سب کا ازالہ کر دے۔ میں بدقسمت تھا تمہاری قدر نہ کر سکا۔ مگر وہ تمہاری دل سے قدر کرے۔ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہے۔ وہ تم سے بے انتہا محبت کرے۔"

اس کے لبوں سے بے آواز وہ کی دعائیں نکل رہی تھیں جو ساری کی ساری اس لڑکی کے نام تھیں، جو اسے محبت کرنا سکھا گئی تھی، جو اسے خلوص اور مودۃ کے معنی سمجھا گئی تھی۔

"فائز عبید! تم بہت خوش نصیب ہو۔ دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ایک عورت تمہیں ملنے جا رہی ہے۔ اس کا ہمیشہ بہت، بہت خیال رکھنا۔ دیکھنا اس کا دل بڑا نازک ہے۔ میرے دیے زخموں سے چور چور ہے، تم اس دل کو کبھی کوئی ٹھیس مت پہنچانا۔"

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے تھے مگر یہ آنسو بابا کی جدائی کے دکھ پر بہنے والے آنسو نہیں بلکہ اس کی دائمی خوشیوں کی سچے دل سے دعائیں مانگنے والے بے ریا اور سچے آنسو تھے۔

☆ ☆ ☆

"وہ واپس آئے گا۔ وہ واپس آئے گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔"

اور وہ واپس آیا تھا۔ اس کا یقین غلط نہیں تھا۔

چاہے ساڑھے پانچ سال بعد سہی، لیکن وہ واپس آ گیا تھا۔ پھر اس آنے والے کو لوٹا کیوں دیا تھا؟ کیا اس لیے کہ اس سے نفرت بہت شدید تھی؟

محبت اور نفرت، یہ دو جذبے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے قریب کیوں ہیں؟ جس کے بارے میں ایک عمر تک یہ یقین رکھو کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں زندگی کے کسی عجیب موڑ پر جا کر اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ وہ نفرت تو صرف ایک دکھلاوا تھی۔ خود کو بہلانے کا ایک بہانہ۔

"تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس روز وہ واپس آئے گا۔ میں واقعی پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی وہیں سے شروع کر دوں گی جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔"

پچھلے کئی سالوں سے جس شخص کے بارے میں اسے یقین رہا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، شدید نفرت، بے انتہا نفرت۔ وہ نفرت اس ایک پل میں کہاں غائب ہو گئی تھی جب وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

"میری زندگی میں واپس آ جاؤ بابا! تمہارے بغیر میری زندگی بہت اداس اور بہت ویران ہے۔" اور وہ اپنے کے لفظوں کے عین مطابق ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی

زندگی کا سفر وہیں سے شروع کرنا چاہنے لگی جہاں ان کا ساتھ چھوٹا تھا۔ وہ دیوانی لڑکی اور اس کی جنونی محبت، وہ تو آج بھی وہیں تھی، اسی مقام پر زندگی کہیں آگے نہیں گئی تھی۔ وہ تو وہیں ٹھہری ہوئی تھی، اسی جگہ۔ اسی انتظار میں محبت میں پاگل ہوئی وہ لڑکی تو نفرت کبھی کرتی ہی نہیں تھی، نفرت تو وہ بیوی کرتی تھی جسے اس کے شوہر نے دھوکا دیا تھا، بیچ راہ میں چھوڑ گیا تھا۔ اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ بیوی اپنے شوہر کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی مگر وہ لڑکی اس کی محبت، نفرتوں سے بہت پرے تھی۔ پاگل پن کی حدوں کو چھوتی اس کی جنونی محبت، انا پرستی سے بہت آگے تھی، بہت دور۔

کیا محبت صرف اچھوں سے کی جاتی ہے؟ خوبیاں دیکھ کر۔ اچھائیاں جانچنے کے بعد۔ محبت اگر سچی ہے تو کبھی کم نہیں ہو سکتی، کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ عورت جو ایک بیوی تھی اور جو انا پرست بھی بہت تھی، چاہے اس دیوانگی پہ کتنا شور مچا لیتی مگر اس لڑکی کی محبت کو ہرا نہیں سکتی تھی۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا عمیر، اگر وہ واقعی اس سے نفرت کرتی تھی تو اتنے برسوں میں کبھی اس سے طلاق کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے پہنائے وہ زیور، جو آج اسے لوٹائے ہیں، کیوں انہیں کبھی خود سے جدا نہیں کر پائی۔ محبت ہی کی وجہ سے ہاں۔

وہ پھر سے اس کے ساتھ اپنی زندگی کو وہیں سے شروع کر دیتی، مگر وہ ایسا کر نہیں پائی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک دوسری عورت کے بسے بسائے گھر کو اجاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے سدرہ آذق سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ جس عورت نے اس کا گھر اجاڑا تھا، اس کا شوہر چھینا تھا، اس کے خوابوں کو مسمار کیا تھا، وہ اس سے ہمدردی رکھتی؟ اسے اس کا شوہر واپس لوٹا دیتی؟ ایسی دیالو نہیں تھی وہ۔ مگر بات سدرہ آذق کی نہیں بات اہل عمیر رضا کی تھی۔ جو اس کی بیٹی نہیں، جس کی وہ ماں نہیں، پھر بھی وہ اس کے ساتھ کچھ برا کرنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ نجانے کیسا رشتہ تھا یہ، جو اسے اس معصوم بچی سے ایسی محبت میں مبتلا کر گیا تھا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ سرخ کلر کا سلیولیس فراک پہنے، وہ گڑیا سی بھولی بھالی اور معصوم سی بچی۔

"یہ میرے ماما، پاپا ہیں۔" اس کے کانوں میں آج بھی وہ پیاری سی آواز گونج رہی تھی۔ وہ اہل سے اس کا گھر کیسے چھین لیتی؟ وہ اہل سے اس کے ماں باپ کیسے چھین لیتی؟

کیسا ظلم کیسے کر دیتی وہ اس معصوم پر؟ عمیر اگر اہل کو اپنے ساتھ لے کر اس کے پاس آتا تو وہ ماں سے محروم ہو جاتی اور اگر وہ اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر اس کے پاس آتا تو باپ سے۔ ہر دو صورتوں میں نقصان تو اہل ہی کا ہو رہا تھا۔

گھر سے محروم، ماں باپ کی محبتوں کو ترسی اہل، کل کہیں ایک اور بابا احمد علی نہ بن جائے۔ ایک گھر کو ترسی، رشتوں کو ترسی، محبتوں کو ترسی بابا احمد علی جو پھر کسی ایک رشتے میں اپنا ہر رشتہ ڈھونڈتے۔ کل پھر وہ بابا احمد علی کسی عمیر رضا کی منتیں کرے، التجائیں کرے کہ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ اپنا ایک رشتہ، واحد رشتہ چھن جانے کا خوف اسے پل پل جینے اور پل پل مرنے کی اذیت نہ دے۔ اس کے پاس ایک گھر ہو، ماں باپ ہوں۔ الجھنوں سے آزاد سیدھی اور ہموار اس کی زندگی ہو، اس کی اپنی ایک مضبوط شخصیت ہو تاکہ کل اگر کوئی عمیر رضا اسے راہ میں تنہا چھوڑ جانے کی بات کرے تو وہ اس جانے والے کے سامنے اپنی انا نہ گنوائے، اس کے آگے ہاتھ نہ جوڑے، اس کے پاؤں نہ پکڑے، بلکہ اس چھوڑ کر جانے والے کی طرف

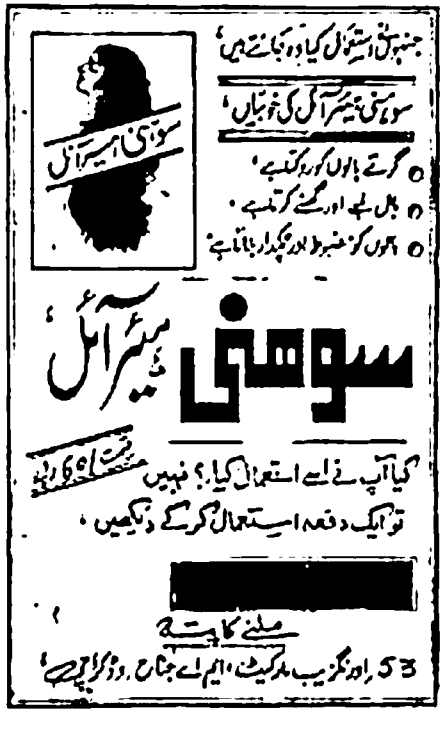

بھی مڑ کر دیکھے بھی نہیں۔

لیکن وہ ماما احمد علی اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ ال سے اس کا گھر کیسے چھین سکتی ہے۔ وہ معصوم بچی جس نے ابھی دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا' وہ اس سے اس کا گھر چھیننے کا' اس سے اس کا باپ چھیننے کا ظلم کیسے کر سکتی ہے۔

"آج تمہارے پاپا کو جو کچھ کہا' جتنی نفرت کا اظہار کیا' جتنے برے الفاظ استعمال کیے اور اسے مایوس لوٹانے کو جو فائز عبید سے شادی کا فیصلہ کیا' سب تمہاری وجہ سے کیا ہے ال۔ ماں نہیں ہوں تو کیا ایک ممتا بھرا دل بھی نہیں ہے میرے سینے میں؟ میں نے تمہارے پاپا کو واپس تمہارے پاس بھیج دیا ہے ال۔ میں نے تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچا لیا ہے ال' تاکہ تم ماما جیسی نہ بن جاؤ۔ تم ایک گھر' کچھ رشتوں اور محبتوں کی تلاش میں دربدر نہیں پھرو گی۔ رشتے تمہیں ڈھونڈنے نہیں پڑیں گے' وہ تمہارے پاس موجود ہوں گے۔

وہ کھڑکی کھول کر کھڑی ہوئی تھی اور باہر اندھیرا ہونے کے باوجود اسے نیچے کھلے آسمان تلے وہ شخص کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی تو اس کے آنسو کیسے نظر آتے۔ مگر وہ پھر بھی یہ بات بتا سکتی تھی کہ وہ گاڑی کے پاس کھڑا رو رہا ہے۔

"تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس روز وہ واپس آئے گا۔" وہ کھڑکی کا پٹ پکڑ کر زار و قطار رو پڑی۔ وہ واپس آنے والا' واپس جانے والا تھا۔ اسے جانے کو خود ہی کہا تھا' مگر اب اسے جاتا دیکھنا اپنی ہمت اور حوصلے سے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ آٹھ سال قبل سولہ فروری کو جڑنے والا ایک رشتہ سولہ فروری ہی کو ٹوٹ بھی گیا تھا۔ "پچاس موم بتیاں کیک پر سمائیں گی کیسے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بہت بڑا سا کیک بیک کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر پچاس موم بتیاں لگائی جا سکیں۔"

"بہت جلدی ہے پچیس سال گزر جانے کی' پچیس سال بعد تم بوڑھی بھی تو ہو جاؤ گی۔" اس کی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ اس کے لبوں سے ایک آہ نکلی۔ ایک سسکی۔ ضدی دل پھر اسے پکارنے کو مچلا۔ اس نے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ روتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ اس کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔ "میرے اللہ...... یہ شخص ہمیشہ خوش رہے' ہمیشہ سکھی رہے تو اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا۔ میرا کوئی حق اس کے ذمہ نہیں۔ میں اپنا ہر حق اسے معاف کرتی ہوں۔ میں نے اسے معاف کر دیا تو بھی اسے معاف کر دے۔ اس سے کوئی سخت حساب مت لینا۔ اسے کوئی سزا مت دینا۔ نہ اس دنیا میں' نہ کل روز حشر میں۔ اس پر رحم فرمانا میرے اللہ.... اس پر رحم فرمانا۔" روتے ہوئے کپکپاتے ہونٹوں سے وہ اللہ کو پکار رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ روتی رہی۔ اس شخص کے لیے' اس کی ان یادوں کے لیے جو کبھی اس کی تھیں۔ وہ آج انہیں آخری بار یاد کر رہی تھی تاکہ کل جب وہ فائز عبید کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرے تو اپنی سوچوں اور اپنی یادوں میں بھی اس کی وفادار ہو کر رہ سکے۔ اس کا دل یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اس نے فائز سے محبت کا کوئی جھوٹا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کسی جھوٹ کے ساتھ نہیں کرنے گی۔

وہ اس کا مخلص دوست پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی دوستی خود بخود محبت میں بدل جائے گی۔ محبت کا تو پتا نہیں مگر اس کے ساتھ انتہائی حدوں تک مخلص اور وفادار وہ مرتے دم تک رہے گی۔ وہ اپنی یادوں اور اپنے خیالوں میں بھی کبھی اس سے بے وفائی نہیں کرے گی۔ فائز کے دل پر زارا کی بے وفائی کا جو گہرا زخم لگا ہے' وہ اس زخم کو اپنے پیار اور اپنی توجہ سے بہت جلدی بھر دے گی۔

اس نے زندگی میں بہت سے خواب دیکھے تھے۔ ایک گھر کے' رشتوں کے' محبت کے۔ اس کا صرف محبت کا خواب ہی تو ٹوٹ کر بکھرا ہے' باقی سارے خواب تو ابھی سلامت ہیں۔ اپنے ایک گھر کا خواب' اپنا کہہ سکنے والے کچھ رشتوں کا خواب اور سب سے بڑھ کر اسے "ماما" کہہ کر بلانے والے ایک ننھے سے وجود کا خواب۔ اسے اپنے ان سارے خوابوں کی تعبیریں حاصل کرنی تھیں۔

اس نے اپنے چہرے پر سے سارے آنسوؤں کو مٹا ڈالا پھر پرس کندھے پر ڈال کر وہ اپنے آفس سے باہر نکل آئی۔ وہ صرف آفس سے نہیں نکلی تھی' وہ یادوں کے حصار سے بھی نکل آئی تھی۔ وہ زندگی کو ایک نیا عنوان دینے جا رہی تھی اور اس نئے عنوان میں وہ بیتے کل کا کوئی پل شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

.com